ایک اور آخری دن

شہناز پروین سحر

ایک اور آخری دن

ایک اور آخری دن

شہناز پروین سحر

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

سانجھ

اُس خلاقِ اعظم کے نام جس کی تخلیق میں ہوں

میری اس کتاب کا انتساب

''کن فیکون''

اللہ جمیل ویحب الجمال

کے نام

فہرست

○ دیباچہ شہناز پروین سحر 13
○ تشکر شہناز پروین سحر 15

غزلیات

1 کر کے اسیر جسم سزا دی گئی مجھے 17
2 کانوں میں ناچتی تھی تری بانسری کی لہر 19
3 مجھ سے لکنت ہوئی اور بات سنبھالی اس نے 21
4 ایک رشتہ بنا رہا ہے مجھے 23
5 یاد آتا ہے اب بھی حیرت ہے 26
6 مجھ سے الگ اک اپنے لئے گھر بنائے گا 28
7 مجھے وجود سے باہر نیا جہان ملا 29
8 میں کیوں چراغ جلاؤں ابھی اُجالا ہے 31
9 ڈوبنے والے سے اتنا رابطہ رہ جائے گا 32
10 تمام عمر محبت کو پالتی ہوئی میں 34
11 زمیں سے گزروں یا آسماں سے نہ جانے کس پل کہاں سے گزروں 36
12 وفا شعار طبیعت بھی ہے بلا کی طرح 38
13 جو موج خوشبوؤں کی تھی گلاب سے نکل گئی 39

14 ماتھے پر اک چاند جڑا ہے 41
15 ایک ہی نکتہ ملے گا سب کے سب اسباق پر 43
16 بساطِ دل پہ شہنشاہ کا پیادہ چلا 44
17 عشق کا گھاؤ جان میں رکھ کر بھول گئی 45
18 بہت سے قرب میں تھوڑا سا فاصلہ رکھنا 47
19 اگرچہ آئینوں جیسی حقیقتیں تھیں بہت 49
20 موم کا گھر بنا رہا ہے کوئی 51
21 اُس رات کچھ عجیب تھا پُروائیوں کا رقص 53
22 یہ دستک اور یہ در میرا نہیں ہے 55
23 میرے اور دنیا کے بیچ اک آئینے جیسا تھا وہ 57
24 میرے سپنوں میں بوئے تھے تم نے جو شرمیلے پھول 59
25 بادل مصوری کا جو شہکار ہو گیا 61
26 خود بنا لیتی تھی میں تو اپنی سب گڑیوں کے گھر 63
27 جادو بھری صداؤں میں پتھر سمیٹ لو 65
28 جا کے صدیوں میں سو گیا لمحہ 67
29 مسجدیں بھر گئیں شبینوں میں 69
30 لہو میں ڈوبے ہوئے جل رہے ہیں شعلوں میں 72
31 زمیں کے گل نگلنا چاہتا ہے 74
32 وہ منتظر ماہ و سال دے گا بہت دنوں میں وصال دے گا 76
33 کاشت پتھر میں ہوا پھول سا میرا سپنا 78
34 جو تیری قید سے نکلوں تو کس قفس میں رہوں 79
35 شاخِ جاں سے گلاب ختم ہوئے 81
36 چھت پر آؤ چاند دکھائی دیتا ہے 82

37 کچھ اچانک ہی تھم گئی ہوں میں 84
38 روداد میرے مرنے کی آغاز سے کہنا 85
39 آنسو میں گُھل رہا ہے تو کاجل اُتار لو 87
40 کسی کتاب پرانی میں رکھ کے آتے ہیں 89
41 دن ہوا اور روشنی ہی نہیں 91
42 اب ہمیں ترکِ تعلق کے نئے گہنے دے 93
43 ندی کو روک سکے گا ڈھلان باندھے گا 94
44 تو نفی ہے تو یہ مثبت سے اشارے کیوں ہیں 95
45 بنجر نہیں کہ پھول نہ کوئی کھلا سکوں 97
46 محروم اُس کے قُرب سے اک شام روبرو 99
47 میری وفائیں پڑی ہوئیں ہیں تیرے رستے رستے میں 100
48 اک خوشبو کا جھونکا باندھے آنچل کی ہریالی میں 102
49 پہلے تو خود اس شخص نے بنیاد بلا دی 103
50 شاعری ہی میری حویلی تھی 105
51 مشکوک اجنبی کوئی سارے گھروں میں ہے 107
52 معبود تجھ سے ایک جبیں چاہیے مجھے 108
53 چھین کر، کرنوں سے بینائی اندھیرا کر دیا 110
54 حرف کے پھول چن کے لاتے تھے 112
55 اک تعلق کی بدنمائی پر 114
56 زندگی کی لکیر جانتی تھی 116
57 سفر کے سامنے دیوار کر کے 118
58 اشک بار آنکھ سر پھرا آنچل 119
59 رینگتے رینگتے اک روز جو قد میں آیا 121

60 مدارِ ہوش سے باہر نکل رہی ہوں میں 122

پنجاب رنگ

1 اوہ اسمان دا تارہ تے میں موتی ڈونگھے پانی دا 124
2 واء کئی ور تے تھلدی رہی 125
3 تیری مرضی دی بُکل وچ اپنے سُکھ کفنائے نیں 126
4 خورے کیہڑے لوک سی جیہڑے اک خدا نوں مندے رہے 127
5 اوہدی آ کڑ کچ دی گڈی سانبھ سانبھ کے رکھاں میں 128
6 بس ایک مُٹھی ستاروں کی دان کر آتا 129

قطعات 134
متفرق اشعار 135

حصہ نظم

1 یا خدا 137
2 ابو جی 138
3 ایک اور آخری دن 139
4 لکھی میّا موری 145
5 فاصلے اور فیصلے 148
6 تدبیر 150
7 کسیرا بازار 151
8 سیکنڈ ہینڈ 156
9 مشغلہ 157
10 نمی دانم چہ منزل بود 158
11 گواہی 166

12	زندہ رہنے کی خواہش	167
13	پاگل لڑکی	168
14	مالک	170
15	ریسپشنسٹ	171
16	بھرم	173
17	میں دکھ دریا کی سوہنی	174
18	میرے پیا گئے رنگون	175
19	گھلّہ	180
20	نصیحت	181
21	ایک سوال	182
22	میرا بچہ	184
23	تعبیر	185
24	کرماں ماری	186
25	تقسیم	190
26	خدا کی نظروں سے گر گئے جو	191
27	ماں	193
28	رائیگاں ریاضتیں	198
29	خواہش خون بلوئے	199
30	خود سے بچھڑی ہوئی لڑکیاں	200
31	ڈراپ سین	202
32	نہ کر میریاں مینڈھیاں مائے	204
33	خزاں بخت	209
34	لمس وہی تھا	211

آراء

○ بہ نوکِ خارمی رقصم راؤ ذوالفقار فرخ 213
○ منظروں اور کومل جذبوں کی مصورہ محبوب صابر 217
○ پہلے ماں پھر شاعرہ ترتیل راؤ 220

دیباچہ

یہ اُس وقت کی بات ہے جب منصورہ احمد کتابیں چھاپ رہی تھیں بارہا اُن کے فون آئے وہ میری کتاب چھاپنا چاہتی تھی۔

کہنے لگیں :

دیکھنا کتنی خوبصورت کتاب چھپے گی گلزار صاحب کی کتابیں بھی چھاپی ہیں تمہیں بھیجوں گی ایک دن پی ٹی وی آئیں میری ٹیبل پر اُنہی کی بھیجی ہوئی کتاب پڑی تھی وہیں بیٹھ گئیں تم مجھے بس اپنی بیاض دے دو اور میں اس کے بعد تمہیں تمہاری کتاب دے دوں گی اس کے علاوہ تمہیں کچھ نہیں کرنا لیکن اس پر جو خرچہ آئے گا؟ میں نے پوچھا:

کوئی خرچہ نہیں آئے گا بابا (احمد ندیم قاسمی صاحب) کہہ رہے تھے گلی کتاب شہناز کی آنی چاہیے وہ دیباچہ بھی لکھیں گے میں یہ سب سن کر اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ ہو رہی تھی پکا ارادہ بھی کر لیا کہ اگلے دن ہی اپنی شاعری والی ڈائیری پہنچا کر ہی دم لوں گی لیکن مجھے دو اور دو چار روٹیوں کے چکر نے اس بری طرح جکڑ رکھا تھا کہ ارادہ کر کے بھی اس طرف توجہ نہیں دے پاتی تھی۔

میرے سسر محترم جناب راؤ محمود علی محمود اپنی کتاب کچی کرن شبنم کا دیباچہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے لکھوانا چاہتے تھے اس سلسلے میں جب وہ ان کے پاس جانے کے لیئے گھر سے نکلے تو میں نے قاسمی صاحب کو فون کیا۔

راؤ محمود علی محمود ابھی آپ کے پاس پہنچنے ہی والے ہیں پلیز قاسمی صاحب آپ جتنے بھی مصروف ہوں اُن کا دیباچہ ضرور لکھئے گا میری بات سُن کر ہنسے ۔ اچھا...... اور آپ کی

کتاب کا دیباچہ؟

اُس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے آپ کو؟

اُس کی تو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

میں نے کہا: ''وہ بھی آپ نے لکھنا ہے۔''

''چلو فیر بھیج دیونا اپنی بیاض وی'' پنجابی اُن کے منہ سے کتنی بھلی لگتی تھی۔

لیکن منیر نیازی کیا دیر کر دیتے تھے جو...... دیر مجھ سے ہوئی...... اتنی دیر کہ قاسمی صاحب ہی چلے گئے۔ میری کتاب کا دیباچہ لکھے بنا ہی چلے گئے ہیں، اب جب وہ نہیں ہیں کتاب چھپ رہی ہے۔

جانے کیوں چھپ رہی ہے، چھپ ہی رہی ہے تو دیباچہ کون لکھے گا؟

کوئی نہیں لکھے گا۔

قاسمی صاحب نہیں ہیں تو میری کتاب کا دیباچہ کیسے لکھا جا سکتا ہے؟

اس لیے اس کتاب کا کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ وہ تو قاسمی صاحب نے ہی لکھنا تھا۔

فنون کے آفس سے اچانک ہی قاسمی صاحب کا فون آجایا کرتا تھا، ابھی تک آپ کی غزلیں نہیں آئیں پرچہ پریس میں جا رہا ہے۔ اب فون اختر صاحب کو دے رہا ہوں انہی کو لکھوا دیں:

میرے پاس تو ایسا کوئی فون بھی نہیں ہے...... جس پر میں قاسمی صاحب سے اپنی کتاب کا دیباچہ حاصل کرلوں قاسمی صاحب......!

میں آپ کی کمی ....

شہناز پروین سحر

تشکر

زندگی کا بہت سارا عرصہ کچھ ایسے گذر گیا کہ میری کتاب محض ایک خیال تھا، جو کبھی کبھی میرا پیچھا کرتا تھا لیکن میں بڑے سکون سے بچ بچا کر اُس کے آس پاس سے گزر جایا کرتی تھی۔ میری عزیز ترین دوست رفعت سجاد نے ایک ریکارڈنگ کے دوران مجھے حیران کر دیا وہ کہہ رہی تھی:

’’میں نے بار ہا شہناز سے کہا ہے کہ اللہ کے واسطے کتاب چھپوا لے مجھے تو شہناز کا لکھا ہوا سب سے پہلا شعر بھی یاد ہے جو اُس نے سولہ سال کی عمر میں لکھا تھا ......اور وہ تھا نا پتا ہے قد مرا......وہ شہر کے مینار سے کوئی دلچسپی نہیں اُس کو مرے کردار سے۔‘‘

کچھ اور دوست جن میں زاہدہ جعفر، ارشاد ارشی، شاہدہ تبسم ٹیپی، فوزیہ رفیق، محبوب صابر، صفدر ہمدانی، عصمت طاہرہ، خرم خلیق، سبھی اپنے اپنے مخلصانہ اور مخصوص انداز میں ہمیشہ مجھے کتاب شائع ہونے کی اہمیت اور ضرورت محسوس کرواتے رہے۔

نگہت نسیم نے سڈنی ریڈیو سے میری شاعری کے سلسلے میں ایک طویل پروگرام نشر کیا جسے بعد میں انہوں نے یوٹیوب پر محفوظ بھی کیا۔ یہ وہی جانتی ہیں کہ اس پروگرام میں انٹرویو دینے کے لیے میں کس طرح سے خود کو آمادہ کر پائی تھیں۔ یہ سب بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے...... کہ اپنی بیماری سے میں اتنی تھکی ہوئی اور نڈھال تھی کہ مجھ سے ٹھیک سے بات تک نہیں کی جاتی تھی۔

ایسے میں بھلا میں کتاب کا کیا تردد کرتی۔ بے شمار احباب نے ہر طرح ...... اور بذریعہ فیس بک بھی میری شاعرانہ کاوشوں کو بہت سراہا......میری اتنی ہمت بندھائی کہ کبھی کبھی

میں خود بھی کتاب چھپوانے کی ضرورت محسوس کرنے لگی تھی۔ آخر میں مسعود قمر نے تو حد ہی کر دی...... میرے خلاف فیس بک پر میرے ہی بنائے ہوئے ایک گروپ میں پوری ایک تحریک چلا دی...... کہ میں اپنی کتاب کیوں نہیں چھپوا رہی۔

اور پھر ساتھیوں کی ایک طویل قطار تھی جس نے اس اُس پروانے پر دستخط کرنے شروع کر دیئے ہر شخص مجھ سے جواب طلب کر رہا تھا کہ آخر کیوں؟ میری کتاب خود میری ہی توجہ سے محروم ہے۔۔ اس سلسلے میں انہوں نے بارہا فون پر کہا کہ یہ کچھ مشکل کام نہیں ہے...... لیکن ایک طویل بیماری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا...... میں خود کو کسی بھی امتحان میں ڈالنے کے قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ میں وہ سب بھاگ دوڑ کر لیتی جو ایک کتاب چھپنے کے لیے ضروری ہو سکتی ہے۔

مسعود قمر صاحب نے یہ سب الجھنیں یوں دور کیں کہ سانجھ کے امجد سلیم صاحب خود میرے گھر تشریف لائے اور اس ضمن میں ہونے والی تمام بھاگ دوڑ اپنے ذمے لینے کی یقین دہانی کرائی۔ عبدالحفیظ کمپوزنگ کے بڑے صبر آزما مراحل سے گزرے...... بار بار میرے کچھ گمشدہ اشعار مجھے مل جاتے تھے وہ جب کتاب مکمل کرتے میں انہیں پھر سے کچھ کچھ کام بتا دیتی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ ابھی بھی میرا بہت سا کام خود مجھ سے بھی اوجھل ہے اسی لیے کچھ نہ کچھ کتاب میں شامل ہونے سے رہ بھی گیا ہے۔ میں محترم راؤ ذوالفقار فرخ صاحب کی بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکالا اور پروف ریڈنگ میں میری بہت مدد فرمائی میں متذکرہ بالا سبھی احباب کی ممنون ہوں کہ وہ خیالات جو میں محض سوچتی اور لکھتی رہی اُن کی مدد سے بالآخر ایک کتاب بن گئے۔

میری ماں، میرے ابو، اور میرے بچے، میرا گھر درحقیقت میرا آس پاس کا سارا ماحول ہمیشہ میری شاعری کی تحریک رہے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ یہ کتاب صرف میری نہیں ہے اُن سبھی کی ہے...... جو اس کتاب کی اشاعت کا سبب بنے۔

سو میرا یہ چھوٹا سا تشکر اپنے سبھی مخلص اور مہربان دوستوں کے نام

شہناز پروین سحر

کر کے اسیر جسم سزا دی گئی مجھے
یوں عمر بھر کی قید سنا دی گئی مجھے

کس مصلحت کے واسطے دینا پڑا فریب
کُن کہہ دیا تو کیسے فنا دی گئی مجھے

اڑتی رہی فلک پہ ستاروں کی اوڑھنی
سر سے بہت ہی دور ردا دی گئی مجھے

اوپر تلے ہیں سنگِ حیات اور سنگِ مرگ
چکی کے دونوں پاٹ میں جا دی گئی مجھے

اس کو عطا ہوئی ہیں گلوں کی صباحتیں
صحراؤں کی سی آب و ہوا دی گئی مجھے

دے دے کے خواہشوں کو مری کانچ کے بدن
کس درجہ احتیاط سکھا دی گئی مجھے

ایڑی اُٹھا کے ساتھ نبھانا پڑا سحر
قد سے بہت بلند انا دی گئی مجھے

کانوں میں ناچتی تھی تری بانسری کی لہر
آنچل میں بھر کے لائے تھے ہم چاندنی کی لہر

پھر تیر کس رہا تھا مرے دل کی سیدھ میں
تاراج کر گئی مجھے شرمندگی کی لہر

دریا کو کس کے ہجر نے پامال کر دیا
پھر چاند رات میں اُٹھی دیوانگی کی لہر

پتھر تراشتے تھے تری صورتوں کے ہم
اور سر میں جاگتی تھی تری بندگی کی لہر

پھر ہجر زندگی میں قرینے سے آ گیا
مسکان میں دبی رہی افسردگی کی لہر

کچھ عشق میری فہم سے آگے گزر گیا
کچھ خاک میں بکھرتی گئی زندگی کی لہر

بس زندگی دھنک سی کھلی اور بجھ گئی
پیچھے تھی ایک مٹتی ہوئی رخصتی کی لہر

بستر لگا گئے ہیں اندھیرے مکان میں
شاید سحر یہیں ہو کہیں روشنی کی لہر

مجھ سے لکنت ہوئی اور بات سنبھالی اس نے
بس کبھی دیکھی نہیں آنکھ کی لالی اس نے

وہ گلے ملتا ہے ملبوس بچا کر اپنا
زندگی کیسی کلف دار بنا لی اس نے

اجنبی سمت میں پرواز تجسس اس کا
دم بخود گھر سے الگ جھوک بسا لی اس نے

اتنا معدوم ہوا وہ کہ نظر سے بچھڑا
لمس کی یاد بھی پوروں سے اٹھا لی اس نے

جسم کے پار مری روح تلک سناٹا
ہجر کی راکھ میں مٹی مری ڈھالی اس نے

موم بتی کے مقابل میں بٹھا کر اس کو
کھینچ لی پھر کوئی تصویر مثالی اس نے

منکشف ہو گیا اک اور مہذب لمحہ
خود جلا کر بھی مری راکھ سنبھالی اس نے

میں سماعت کا ہنر بھول ہی جاؤں نہ سحر
چھو کے دیکھی ہے میرے کان کی بالی اس نے

ایک رشتہ بنا رہا ہے مجھے
ایک رشتہ مٹا رہا ہے مجھے

یہ دیا چُپ نہیں رہا شب بھر
اک کہانی سنا رہا ہے مجھے

اب مجھے کیل سے لٹکنا ہے
پینٹنگ سی بنا رہا ہے مجھے

اشک آنکھوں میں ریت سانسوں میں
عشق کیا کیا سکھا رہا ہے مجھے

آگ کا راگ ہے اِسے مت چھیڑ
بے خبر کیوں جلا رہا ہے مجھے

لوک دھن جیسی کھو گئی تھی میں
جانے اب کون گا رہا ہے مجھے

سارے دُکھ سُکھ اُلجھ گئے آخر
وقت سب کچھ بُھلا رہا ہے مجھے

آگ ہی آگ کا ازالہ تھی
وقت کندن بنا رہا ہے مجھے

میں نہیں جانتی بُرا یا بھلا
کچھ نہ کچھ یاد آ رہا ہے مجھے

ہر طرف اک پکار سنتی ہوں
کوئی اپنا بُلا رہا ہے مجھے

ایک دریا جو اُلٹا بہتا ہے
ساتھ اپنے بہا رہا ہے مجھے

جیسے میں ریت گا گھروندا تھی
توڑ کر پھر بنا رہا ہے مجھے

باندھ کر میری دونوں آنکھوں کو
کوئی منظر دکھا رہا ہے مجھے

میرے پر کاٹنے کے بعد سحر
گھونسلے سے گرا رہا ہے مجھے

یاد آتا ہے اب بھی حیرت ہے
حافظہ ہے یا کوئی ذلت ہے

کتنے رشتوں پہ موت واجب ہے
کس محبت میں کتنی نفرت ہے

ایک آنسو کبھی گرا ہی نہیں
وہ میرے ضبط کی عبادت ہے

ریگِ جاں کی تپش ہے جوبن پر
اب مجھے رقص میں سہولت ہے

قبر پر پھول اور کچھ فوٹو
اب یہی آخری ہزیمت ہے

ہم ہی گزرے ہیں یہ نہیں گزرا
وقت ہی وقت کی مصیبت ہے

زندگی ہے تِری عطا مالک
زندہ رہنا مِری عبادت ہے

آنکھ جھپکی تو وہ چلا بھی گیا
تیرا ملنا کمال عجلت ہے

بد نصیبی ہے انتہا کی سحر
ہجر اب میری وجہ عزت ہے

مجھ سے الگ اک اپنے لئے گھر بنائے گا
اب وہ بغیر سانس کے جی کر دکھائے گا

میں سنگ تو نہیں ہوں مگر پھر بھی بچ کے چل
تو آئینہ نہیں ہے مگر ٹوٹ جائے گا

خود جستجو تراشے گی منزل کے خدوخال
احساس آپ چہرے پہ آنکھیں بنائے گا

اب خود زمیں نہ تھامے گی اُٹھ کر فلک کا ہاتھ
اب آسماں زمیں کی طرف جھک کے آئے گا

مت اس کے بچپنے کا برا ماننا سحر
وہ تم کو توڑ پھوڑ کے پھر سے بنائے گا

مجھے وجود سے باہر نیا جہان ملا
یہاں زمین نہیں مجھ کو آسمان ملا

تمام عمر کی تنہائی ایک شکل بنی
تو تب کہیں مجھے مجھ جیسا بے زبان ملا

خود اپنی ذات کے جلتے ہوئے الاؤ میں
گمان اپنے جلائے تو مجھ کو گیان ملا

تری تلاش میں اپنا بھی کچھ نشان ملا
مجھے مکان کی اندر ہی لامکان ملا

مری ہی کرچیوں سے ایک نیا وجود ڈھلا
پھر اس کے بعد مجھے شہر بے امان ملا

سحر تو بات کو کر اپنے ہی سکوت سے کر
جو لفظ مر گئے ہیں ان میں تھوڑی جان ملا

میں کیوں چراغ جلاؤں ابھی اُجالا ہے
وہ شخص بچھڑا نہیں ہے بچھڑنے والا ہے

بغیر چھید کے موتی نہیں پروئے گئے
مرے گلے میں تو دھاگے کی ایک مالا ہے

نئ رُتوں میں پرانی ضرورتیں نہ اُگا
اُن عادتوں کو بڑی مشکلوں سے ٹالا ہے

شکستہ چھت مری تُجھ پر ہی آ گرے نہ کہیں
مرے خلوص نے گھر سے تُجھے نکالا ہے

جوان عمر میں ہی بوڑھی ہو گئی ہوں سحر
انا کا لاڈلہ بچہ کچھ ایسے پالا ہے

ڈوبنے والے سے اتنا رابطہ رہ جائے گا
پانیوں کی چیخ میں اک دائرہ رہ جائے گا

ہم بھلے چاہیں نہ چاہیں زندگی کٹ جائے گی
راہ رو کے بعد خالی راستہ رہ جائے گا

آج بھی سورج زمیں کو اوڑھ کر سو جائے گا
آہٹوں اور دستکوں کا واہمہ رہ جائے گا

لمس پوروں سے تو کیا آنکھوں سے بھی دھولو گے تم
خون کا دھبا سا لیکن جا بجا رہ جائے گا

ہوں گے سب پامال آخر جنگ، اور سامان جنگ
بس زمیں کی گود میں اِک سانحہ رہ جائے گا

میں خزاں دِیدہ ہوں میری پتّیاں مُرجھا چُکیں
ریت پر برسے گا جب بادل تو کیا رہ جائے گا

حسرتوں کے اُس طرف جھانکا تو پھر کچھ حسرتیں
زندگی میں دُور تک یہ سلسلہ رہ جائے گا

مجھ کو آنکھوں کے عوض دھوکا تھما کر چل دیا
میری بینائی سے ہر منظر چُھپا رہ جائے گا

مُسترد خواہش کو وہ خواہش نہیں کہتا سحر
عکس مر جائے گا، لیکن آئینہ رہ جائے گا

تمام عمر محبت کو پالتی ہوئی میں
اور آج دل سے محبت نکالتی ہوئی میں

سلگتی لکڑی پہ روٹی کو سینکتا ترا غم
ہر ایک آنسو کو چپ چاپ ٹالتی ہوئی میں

مجھے تو ماں نے کہا تھا ہمیشہ کم بولو
پھر اپنی چپ کو مسلسل سنبھالتی ہوئی میں

مجھے خبر تھی کہ لفظوں سے آنچ آتی ہے
سلگتے جذبوں کو گاگر میں ڈالتی ہوئی میں

تھے انتظار میں کچھ پھول تتلیاں اور گیت
دیئے کی لو سے اندھیرے اُجالتی ہوئی میں

ترے غرور کے پتھر سے ضبط سیکھا ہے
وگرنہ چوڑیوں کے کانچ پالتی ہوئی میں

وہ وقت اب بھی مرے دل میں مسکراتا ہے
فراک پہنے ہوئے گیند اُچھالتی ہوئی میں

دبے قدم ہی بڑی ہوگئی تھی میں بھی سحر
بس آٹا گوندھتی کنگن سنبھالتی ہوئی میں

زمیں سے گزروں یا آسماں سے نہ جانے کس پل کہاں سے گزروں
میں بے جہت چل پڑی ہوں دیکھو خطر کے کس کس نشاں سے گزروں

یہ عشق ہے یا طلسم کوئی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی ہوں
مراجعت کا جو گیان پاؤں تو میں بھی صحرائے جاں سے گزروں

وفور ہجراں شگافِ جاں تھا غروبِ جاں تک بکھر گیا ہے
ہتھیلیوں پر دیے جلائے دھواں دھواں رفتگان سے گزروں

میں آئینہ ہوں تو عکس در عکس ہجر میرا نصیب ٹھہرا
وہ سنگ چہرہ سراغ پاؤں تو فکر سود و زیاں سے گزروں

تو آسماں کا ستارہ اور میں سمندروں کی تہوں کا موتی
تو کیسے آبِ رواں سے گزرے میں کس طرح کہکشاں سے گزروں

بس ایک لمحے کی سلطنت میں درون حیرت ملی فقیری
تیاگ کی منزلوں کی چھو لوں جنون کی داستاں سے گزروں

میں بے ہنر ہوں سو بے خطر ہوں کمال ہے نہ ملال کوئی
میں منتظر ہوں کہ اذن پا کر وجود کے خاکداں سے گزروں

دبیز چپ کو گلے لگاؤں سحر میں چپ چاپ ڈوب جاؤں
سمندروں کو گلے لگا کر چلو میں آبِ رواں سے گزروں

وفا شعار طبیعت بھی ہے بلا کی طرح
چمٹ گئی ہے مری جاں سے بد دعا کی طرح

عجیب چاند تھا جیسے ہزار سورج ہوں
دہکتی دھوپ برستی رہی گھٹا کی طرح

اب اس کی بیت چکی دوستی عزیز ہوئی
اب اور بھی وہ ضروری ہوا، ہوا کی طرح

حصول اس کا کسی سانحے سے کم تو نہ تھا
خلوص اس کا تھا گویا کڑی سزا کی طرح

میں اپنی ذات کے پسماندگان میں ہوں سحر
وہ شخص مجھ کو ملا بھی تو خوں بہا کی طرح

جو موج خوشبوؤں کی تھی گلاب سے نکل گئی
میں مضمحل تھی اس قدر شباب سے نکل گئی

وہ لمس بڑھ چکا تھا اب قریب سے قریب تر
سو میں نے فیصلہ کیا، حباب سے نکل گئی

شریک دوڑ میں ہوئے سفر بھی اور قیام بھی
تو رخشِ وقت، میں تیری رکاب سے نکل گئی

یہ زندگی، یہ رخصتی اس کی ہیں امانتیں
شکستہ جسم میں ترے عذاب سے نکل گئی

میں لکھ رہی تھی داستاں، ترا بھی نام آ گیا
کہانی اپنے آپ ہی کتاب سے نکل گئی

سوال کا جواب بھی سوال ہی سے دے گا تو
جھمیلا ساز، میں تیرے سراب سے نکل گئی

میں مبتلائے آرزو تھی آروز سے جاگ اُٹھی
اور اگلے پل ہی زندگی حساب سے نکل گئی

نراش چاند تیرگی میں گُھل کے شانت ہو گیا
سحر میں نیند میں چلی تو خواب سے نکل گئی

ماتھے پر اک چاند جڑا ہے
گھر پھر بھی تاریک پڑا ہے

داغ رہا ہے سوہل کلائی
بانہہ میں سرخ انگار کڑہ ہے

دلہن گھٹ کر مر جائے گی
مان لیا سسرال بڑا ہے

برف پہ اپنے نام کھدے ہیں
سر پر سورج آن کھڑا ہے

پنچھی پر جانے کیا بیتی
پنجرے میں اک پنکھ پڑا ہے

ماں کے پیار سے مہنگی موٹر
بچہ اپنی ضد پہ اڑا ہے

دھرتی مانگے بیج اور پانی
دہقاں خالی ہاتھ کھڑا ہے

رستے میں ہے آگ کا دریا
سحر ترا کاغذ کا گھڑا ہے

ایک ہی نکتہ ملے گا سب کے سب اسباق پر
اک دیا بُجھنے کو ہے اب زندگی کے طاق پر

میں کہ جس کے زہر سے ہوں جاں گسل اور جاں بہ لب
سانپ وہ مامور ہے خود زہر کے تریاق پر

خاک سے میرا وجود اور خاک پر میرے سجود
زندگی لکھی ہوئی ہے خاک کے اوراق پر

بساطِ دل پہ شہنشاہ کا پیادہ چلا
کہیں رُکا تو کہیں پر بہت زیادہ چلا

یہ میری زندگی تھی جس کو جی لیا تو نے
یہ تیرا حق تھا جو مُجھ پہ بہت زیادہ چلا

پھر ایک قتل ہے اور خوں بہا نہیں واجب
کہ تیر ظلِ الٰہی سے بے ارادہ چلا

مسافتوں کے اندھیرے میں چاند روشن تھا
قیام ذہن میں تھا اور سفر کا وعدہ چلا

وہ ایک رِشتہ جو ٹوٹا تو یوں لگا تھا سحر
سمے کے تخت سے اب دل کا شاہ زادہ چلا

عشق کا گھاؤ جان میں رکھ کر بھول گئی
خود کو آتشدان میں رکھ کر بھول گئی

نرگس کے دو پھول اُٹھا کر پھینک دیئے
اور آنکھیں گلدان میں رکھ کر بھول گئی

کچھ آنسو تو آنکھوں میں چُھپ جاتے ہیں
کچھ آنسو مسکان میں رکھ کر بھول گئی

گھونسلہ تھا اور تیز ہوا کی ٹھوکر تھی
میں تنکے طوفان میں رکھ کر بھول گئی

جس کی خاطر شاعری کرتی رہتی تھی
اب اُس کو دیوان میں رکھ کر بھول گئی

کیا کھویا کیا پایا کچھ مت پوچھ سکھی
جیون اک ہذیان میں رکھ کر بھول گئی

سانسوں کی مزدوری میں جو عشق ملا
اک شاہی فرمان میں رکھ کر بھول گئی

جلتی دھوپ میں چاند کا تحفہ کیا کرتی
شاید میں دالان میں رکھ کر بھول گئی

سورج چاند بھی جا کر لوٹ ہی آتے ہیں
عمر اسی امکان میں رکھ کر بھول گئی

پھول سے رشتے پتی پتی بکھرے تھے
پت جھڑ کو سامان میں رکھ کر بھول گئی

اُس لہجے کی اوس میں جو آنچل بھیگا
اک ٹوٹے پیمان میں رکھ کر بھول گئی

آج سحر اُن دو ہنستی ہوئی آنکھوں کو
یادوں کے جزدان میں رکھ کر بھول گئی

بہت سے قرب میں تھوڑا سا فاصلہ رکھنا
تمہاری ضد ہمیں نیندوں میں جاگتا رکھنا

جو دلدلوں میں گرے اُن کے ہاتھ بھی نہ بچے
یہ موت کا ہے سفر تم کو ساتھ کیا رکھنا

کہ زندگی کی طرح موت رائیگاں ہی رہے
ہمارے قتل کا کچھ بھی نہ خوں بہا رکھنا

بہا دیا ہے سمندر میں بھی جلا کے چراغ
کُھلے فلک پہ بھی اک چاند کا دیا رکھنا

سنگھار اپنا ہے بالوں میں اُس کے نام کے پھول
ہتھیلیوں میں اُس اک نام کی حنا رکھنا

فصیل ذات میں بس ایک عمر کاٹنی ہے
یہاں سے لوٹ کے جانا ہے در کُھلا رکھنا

اِک عمر بیت گئی اُس کی رنجشیں نہ گئیں
سحر ہمیں سے نہ ممکن ہوا گلہ رکھنا

اگرچہ آئینوں جیسی حقیقتیں تھیں بہت
ہمیں کو راہ بھٹکنے کی عادتیں تھیں بہت

وفا پسند تھا لیکن وفا شعار نہ تھا
وہ کچھ بھی تھا ہمیں اس سے محبتیں تھیں بہت

کبھی وہ لوٹ بھی آیا تو کیا ملے گا اسے
وجود خاک کو درپیش ہجرتیں تھیں بہت

بس ایک مٹھی ستاروں کی مجھ کو دے دیتا
اندھیرے گھر کو سجانے کی حسرتیں تھیں بہت

مرا چراغ بجھانے کو آفتاب آیا
اس ایک موم کے گھر پر تمازتیں تھیں بہت

اب آج یوں ہے کہ وہ یاد تک نہیں آتا
کبھی وہ دن تھے کی اس کی ضرورتیں تھیں بہت

ذرا سا فاصلہ رکھتے تو ہم سنبھل جاتے
جدائیوں کا سبب بھی تو قربتیں تھیں بہت

یہ کیا کہ چاند کی مشعل بھی بجھنے والی ہے
ابھی تو تیرہ شبی میں مسافتیں تھیں بہت

تمھارا گیت سحر چیخ بن گیا آخر
سمے کی تال پہ ہے جوڑ سنگتیں تھیں بہت

موم کا گھر بنا رہا ہے کوئی
دھوپ سے ڈر بنا رہا ہے کوئی

خاک کو خاک میں لپیٹے گا
میری چادر بنا رہا ہے کوئی

دور اس گھر کے تیرہ آنگن سے
میرا اک گھر بنا رہا ہے کوئی

مجھ کو پرواز کی بشارت ہے
اب مرے پر بنا رہا ہے کوئی

جس کو رب نے بنایا تھا انساں
اس کو بندر بنا رہا ہے کوئی

سبز رت کے حسین موسم میں
کھیت بنجر بنا رہا ہے کوئی

آنکھ کے اک لرزتے آنسو کو
اک سمندر بنا رہا ہے کوئی

ان گنت خواہشات کی دھن میں
خود کو جوکر بنا رہا ہے کوئی

میری مٹی بکھیر کر شاید
مجھ سے بہتر بنا رہا ہے کوئی

مُڑ کے کیا دیکھتی ہوں میں یہ سحر
مجھ کو پتھر بنا رہا ہے کوئی

اُس رات کچھ عجیب تھا پُروائیوں کا رقص
شاید مرے لیے تھا وہ شہنائیوں کا رقص

جھمکا بجھا بجھا سا تھا چنری گری گری
مہندی کی زرد رات میں وہ مائیوں کا رقص

پھر شام آئی اور پریشان کر گئی
چاروں طرف بپا ہوا تنہائیوں کا رقص

کچھ چاند کی تلاش میں کجلا گئی تھی رات
کچھ ماند پڑ گیا وہ رعنائیوں کا رقص

اُس زلزلے نے لوٹ لیں آنگن کی رونقیں
بنیاد ڈھے گئی بچا انگنائیوں کا رقص

کچھ حادثوں کو گونج پہاڑوں میں رہ گئی
خالی نشیب میں ہے فقط کھائیاں کا رقص

اس کا ہر ایک جھوٹ اذیت بڑھا گیا
تھا مجھ میں موجزن میری سچائیوں کا رقص

تم، ناشتے کی میز، اور اخبار کی تھرک
چائے کے مگ میں تھم گیا بالائیوں کا رقص

اک خوف اُتر رہا تھا سحر دل کے آر پار
میں ڈر گئی تھی دیکھ کے پرچھائیوں کا رقص

یہ دستک اور یہ در میرا نہیں ہے
اب اس بستی میں گھر میرا نہیں

سفر ہے اور ہی درپیش مجھ کو
یہ مشتِ خاک گھر میرا نہیں ہے

میں کس بارود میں بکھری پڑی ہوں
یہ دھڑ میرا ہے سر میرا نہیں ہے

مجھے میرے حوالے کر گیا ہے
تو کیا ہے وہ اگر میرا نہیں ہے

یہ کس آنگن میں جھکتا جا رہا ہے
شجر میرا ہے گھر میرا نہیں ہے

سفر ہے خواب میں صحرائے جاں کا
مگر وہ ہمسفر میرا نہیں

میں کیوں اُس کی کہانی بن گئی ہوں
اگر وہ حرف گر میرا نہیں ہے

عجب سی آنچ دل تک آ رہی ہے
یہ شوریدہ شرر میرا نہیں ہے

شبِ سجدہ جبیں پر جم گیا کیا
یہ داغ عشق اگر میرا نہیں ہے

عروس شام روتی پھر رہی ہے
ہر آنسو چشم تر میرا نہیں ہے

جو میرے ساتھ چلتا جا رہا ہے
وہ سایہ ہے مگر میر انہیں ہے

سحر یہ اور ہی دنیا ہے کوئی
یہاں کوئی بھی ڈر میرا نہیں ہے

میرے اور دنیا کے بیچ اک آئینے جیسا تھا وہ
اور پھر اِک روز کیسا ٹوٹ کر بکھرا تھا وہ

عظمتوں کے خول میں اک ریت کا مینار تھا
آندھیوں کے دن یہ جاتا کس قدر اونچا تھا وہ

پتھروں کے شہر سے بھی پھول لے کر آئے گا
مان لیتی تھی میں اُس کی بات جو کہتا تھا وہ

میں کہ تھی اک لہر دریا کھوجنے آئی ہوئی
گرم صحرا کی طرف جاتا ہوا رستہ تھا وہ

وہ کہ جس پر چاند کی تفسیر لکھنی تھی مجھے
دل کے دامن پر کُھلا تو کس قدر میلا تھا وہ

ساری دُنیا لگ رہی تھی جس کا پس منظر سحر
میری آنکھیں کھو گئیں جس روز دھندلایا تھا وہ

میرے سپنوں میں بوئے تھے تم نے جو شرمیلے پھول
آج وہ چہرے پر کھل آئے بن سرسوں کے پیلے پھول

سرخ گلابوں کی محفل میں میری آنکھیں گم سم ہیں
میرے بالوں میں سجتے ہیں تنہائی کے پیلے پھول

تم نے سب کو چھوڑ کے مالا میرے گلے میں ڈالی تھی
مجھ سے کب چھپتے تھے ہنستے بولتے رنگ رنگیلے پھول

جانے دھیان میں کیا آیا گلدان چھٹا ہے ہاتھوں سے
بکھر گئے سنگین زمیں پر کانچ کے سنگ سجیلے پھول

میرے من گلشن میں کوئل میٹھے گیت سناتی تھی
تیری آنکھوں میں کھلتے تھے کیسے کیسے نیلے پھول

سرما کی اس رات میں ہم کتنے خاموش رہے تھے جب
بات بنا اچھے لگتے تھے ہونٹوں کے پتھریلے پھول

چاند تمہارا قاصد تھا ہر شام سندیسہ لاتا تھا
میں کرنوں کے ہاتھ تمھیں بھجواتی تھی چمکیلے پھول

میں نے پیار سے چوم لیا تو نیلے پڑ گئے ہونٹ مرے
تو نے خط میں رکھ کر بھیجے تھے کتنے زہریلے پھول

پورے چاند کی تنہائی پر رات بہائے نیر سحر
آج گلے سے لگ کر روئے یادوں کے کچھ گیلے پھول

بادل مصوری کا جو شہکار ہو گیا
اور پھر ہوا کے حکم سے مسمار ہو گیا

دیکھا جو مُڑ کے راکھ ہوا آرزو کا شہر
سارا طلسم پل میں ہی بے کار ہو گیا

ہر صبح جیسے کل کا ہی اخبار چھپ گیا
ہر روز ایک حادثہ تیار ہو گیا

اتنی گرفت تتلی کے پر ٹوٹنے لگے
وہ پیار کر رہا تھا مگر وار ہو گیا

سورج جلا کے بجھ گیا ننھا سا جو دیا
لوگوں کو اس کی ذات سے انکار ہو گیا

جب دن ہوا تو جیسے کوئی معجزہ ہوا
دل رات کے سکوت سے بیزار ہو گیا

پھر کوئی کام ڈھب سے نہیں ہو سکا سحر
وہ ہاتھ داہنا تھا جو بے کار ہو گیا

خود بنا لیتی تھی میں تو اپنی سب گڑیوں کے گھر
مجھ سے کیوں میرا گھروندا بن نہ پایا عمر بھر

سانس کی حدت سے رُخ کی چاندنی سنولا گئی
سانپ کی پھنکار سی ہے زندگی کی رہگزر

زندگی کو یوں ہوائیں تھام کر چلنا پڑا
باندھ کر آنکھیں چلے رسی پہ جیسے بازیگر

کانچ کا ناطہ چٹخ جانے سے پہلے توڑ دے
اس اُبھرتے نقش منفی کو مٹا دے نقش گر

خاک سے میرا وجود، اور خاک پر میرے سجود
زندگی لکھی ہوئی ہے خاک کے اوراق پر

آنسوؤں کی سرد شبنم تا سحر گرتی رہی
لوٹتے قدموں سی چاپ آتی رہی ہے رات بھر

کس قدر آسودگی سے آ گئی اتنی دراڑ
وہ بھی مجھ سے بے خبر ہے میں بھی اس سے بے خبر

دل کے شیشے پر نہیں ہے اب کسی خواہش کی دھول
بے سبب مکڑی نے جالا بن دیا دیوار پر

تم نے تو لوہے کے پیڑوں پر کھلے دیکھے تھے پھول
تم سے کیوں اک موم کا پتھر نہیں پگھلا سحر

جادو بھری صداؤں میں پتھر سمیٹ لو
پھر پتھروں کے ساتھ میرے سر سمیٹ لو

یادوں کے پھول وقت کی ندی میں بہہ گئے
ہم جن پر ہنس رہے تھے وہ منظر سمیٹ لو

یہ ریت کا مکان ہے اور آندھیوں میں ہے
تم خود بکھر سکو تو میرا گھر سمیٹ لو

میں نے تو سر کو ڈھانپ لیا غم کی دھول سے
تاروں بھری یہ رات کی چادر سمیٹ لو

پگلی نے جان ہار دی چلتی سڑک کے بیچ
رستہ رکا ہوا ہے یہ پیکر سمیٹ لو

تم وقت کی صلیب پہ تھکنے لگیں سحرؔ
خود کو حریم ذات کے اندر سمیٹ لو

جا کے صدیوں میں سو گیا لمحہ
سچا ادراک اور کھرا لمحہ

ایک پل عمر پر محیط ہوا
عمر کا ساتھ بن گیا لمحہ

کمپیوٹر میں بات کرتا ہے
تیز چاہت کا بھاگتا لمحہ

جگنوؤں تتلیوں کا متلاشی
زندگی ایک سر پھرا لمحہ

اب میں اس کو کہاں تلاش کروں
عمر کے ساتھ کھو گیا لمحہ

بے سکوں رات مضطرب نیندیں
اور اک جاگتا ہوا لمحہ

کیا خبر تھی جدائیاں دے گا
وہ ملاقات سے سلا لمحہ

چاند کی طرح ساتھ چلتا تھا
اک ستارہ شناس تھا لمحہ

وقت پامال کر چکا ہے سحر
تیرا ہر ہنستا کھیلتا لمحہ

مسجدیں بھر گئیں شبینوں میں
ابر رحمت برس یقینوں میں

سیپوں میں چھپے ہوئے آنسو
ڈھل گئے کانچ کے نگینوں میں

شام کی کھڑکیوں کے اس جانب
شب کھڑی ہے اُداس زینوں میں

آج کا دن بھی چھپ گیا جا کر
رات کے بے نشاں خزینوں میں

عمر پھیلی ہوئی ہے صدیوں پر
بیت جائے گی کچھ مہینوں میں

جوڑے بنتے ہیں آسمانوں پر
پھر بچھڑتے ہیں کیوں زمینوں میں

کیا تم اب بھی انہی میں رہتے ہو
نازنینوں میں، مہ جبینوں میں!

کچھ دعائیں ہیں زرد ہاتھوں میں
اور کچھ نیل ہیں جبینوں میں

کیا سمندر کی سیپیوں میں ہے تو
کیا پہاڑوں میں؟ کیا زمینوں میں؟

میرے رب تو کہاں ملے گا مجھے
ان مکانوں میں یا مکینوں میں

لوگ خود فاصلے بناتے ہیں
آسماں ہیں انہی زمینوں میں

آخری سانس تک نہ جان سکے
سانپ پلتے ہیں آستینوں میں

کون سی خاک پر جنم لیں گے
دفن ہونا ہے کن زمینوں میں

جسم ہیں قبر کی حراست میں
روح آزاد ہے دفینوں میں

اب میں شاید کہیں نہیں ہوں سحر
عکس میں اور نہ آبگینوں میں

لہو میں ڈوبے ہوئے جل رہے ہیں شعلوں میں
یہ راج ہنس کبھی تیرتے تھے جھیلوں میں

اب اُس کار دور کہیں لاشعور میں گھر ہے
وہ شخص اب نہیں رہتا ہماری سوچوں میں

ادھر کل ایک شکاری چمن سے گزرا تھا
شریر چڑیا کہیں بھی نہیں ہے پتوں میں

ہتھیلیوں نے حنا مانگنے کا جرم سہا
ابھی گلاب سجانے تھے ہم نے بالوں میں

ابھی ابھی یہاں کچھ پنچھیوں کی ڈاریں تھیں
اب اِک اکیلا پرندہ بچا ہے آنکھوں میں

تم اپنے ماتھے کی تحریر سے پریشاں ہو
الجھ گئی ہیں لکیریں ادھر بھی ہاتھوں میں

بجھی ہوئی ہوں سحر دفتری جھمیلوں میں
کھِلے گی شام مگر چاند جیسے بچوں میں

زمیں کے گل نگلنا چاہتا ہے
پہاڑ اب آگ اُگلنا چاہتا ہے

ہوا کے ساتھ چلنا چاہتا ہے
مرا بچپن مچلنا چاہتا ہے

اسے کہہ دو کہ صورت بھی بدل لے
فقط کپڑے بدلنا چاہتا ہے

کھلونے میں دھماکے کی خبر ہے
مگر بچہ بہلنا چاہتا ہے

مجھے پربت سے کھائی تک دھکیلا
وہ کیسے خود سنبھلنا چاہتا ہے

ابھی کچھ دیر پہلے ہاتھ تھاما
اور اب وہ ہاتھ ملنا چاہتا ہے

بالآخر خود سحر پتھرا گئی جب
تو وہ پتھر پگھلنا چاہتا ہے

وہ منتظر ماہ و سال دے گا بہت دنوں میں وصال دے گا
پھر اپنی اوجھل رفاقتوں کو مری نظر میں اُجال دے گا

پسینہ پونچھے گا آستیں سے نظر اُٹھائے گا پھر یقیں سے
مرے سوالوں پہ مسکرا کر وہ مجھ کو حیرت میں ڈال دے گا

کمال ٹھنڈک سے ہنس پڑے گا وہ بادلوں سا برس پڑے گا
اور اگلے لمحے دہکتا سورج وہ میری جانب اُچھال دے گا

کہا اجالوں پہ دسترس ہے کہا کہ اب چاند پر بھی بس ہے
کہا وہ میرے سبھی ستارے اک اور چنری میں ڈال دے گا

یہ وقت اب جس کا سامنا ہے مجھے یہ سرکش سنبھالنا ہے
یہ اب نئی صورتوں کے صدمے نئی طرح کے ملال دے گا

مرے تصور کو گھر دیا تھا وہ گھر جو پھولوں سے بھر دیا تھا
بھری بہاروں میں سبز شاخوں کو زرد رُت کا زوال دے گا

وہ دھڑکنوں کی شکست ٹھہرا تو حوصلہ کتنا پست ٹھہرا
سحر تمھیں جب رُلا چکے گا تو آنسوؤں کو رومال دے گا

کاشت پتھر میں ہوا پھول سا میرا سپنا
اے مرے خواب اسی سنگ سے تو بھی اگنا

میں کبھی ہاتھ بڑھاؤں تو فلک پاس لگے
جیسے بس میں ہو مرے چاند ستارے چننا

اس نے بھی دیکھا تھا وہ خون میں ڈوبا ہوا چاند
اس سے پھر بھی نہیں چھوٹا مجھے چندا کہنا

رینگ کر چلنا پڑا تیز طبیعت کو سحر
کتنا اچھا لگا پر اس کا سویٹر بننا

جو تیری قید سے نکلوں تو کس قفس میں رہوں
میرا جواز یہی ہے کہ تیرے بس میں رہوں

بڑے خلوص سے جھیلوں میں تیری خود غرضی
بڑے زیاں سے ترے قریہ ہوس میں رہوں

میں کارواں نہ سہی گرد کارواں ہی سہی
سفر کی دھول بنوں نالۂ جرس میں رہوں

ورق ورق میں سنبھالا گیا ہے وقتوں کو
میں ایک ذکر مسلسل جو پیش و پس میں رہوں

سے کی آخری سیڑھی پہ تھک کے بیٹھی ہوں
غروب جاں لیے ماٹی کی دسترس میں رہوں

پلٹ کے دیکھوں تو اکثر یہ سوچتی ہوں سحر
میں اپنی عمر گزشتہ کے کس برس میں رہوں

شاخِ جاں سے گلاب ختم ہوئے
سب وہ آنکھوں کے خواب ختم ہوئے

زندگی خامشی کے سُکھ میں ہے
خواہشوں کے سراب ختم ہوئے

پھول اوراق میں چھپائے تھے
عمر بیتی کتاب ختم ہوئے

دیکھ ترکِ تعلقات کے سکھ
بے حسی کے عذاب ختم ہوئے

وہ خدائی نبھا سکا نہ سحر
سب گناہ و ثواب ختم ہوئے

چھت پر آؤ چاند دکھائی دیتا ہے
شام ڈھلے تو وقت سنائی دیتا ہے

ہم نے آنکھیں میچ کے تم کو دیکھا تھا
سچ پوچھو تو یوں بھی دکھائی دیتا ہے

خوشیوں کی نقدی برسا دی دنیا پر
مجھ کو گن کر پائی پائی دیتا ہے

پانی میں کنکر مت مارو دھیان کرو
لپک جھپک میں چاند دہائی دیتا ہے

گلشن گلشن خوشحالی چھا جاتی ہے
خوشبو بن کر پھول کمائی دیتا ہے

کیا دن تھے جب سرخ گلاب ہمارے تھے
چڑھتا سورج رنگ حنائی دیتا ہے

سنو سحر تم آئینے سے دور رہو
اس میں کوئی اور دکھائی دیتا ہے

کچھ اچانک ہی تھم گئی ہوں میں
برف کی سِل میں جم گئی ہوں میں

کوئی قدرت سے لڑ پڑا شاید......
چشمِ حیرت سہم گئی ہوں میں

یہ اناؤں کی راج دھانی ہے......
بے سبب کچھ قدم گئی ہوں میں

تیری دنیا کے سومنات میں کیوں
لے کے اپنا صنم گئی ہوں میں

دل کا کمرہ بُلا رہا ہے سحرؔ
آج اُس سمت کم گئی ہوں میں

روداد میرے مرنے کی آغاز سے کہنا
وہ رو نہ پڑے سن کے اس انداز سے کہنا

کچھ پل ہمیں رودادِ محبت میں ملے تھے
ان کا نہ کہیں ذکر ہو ہمراز سے کہنا

ذروں میں ستاروں میں چراغوں کی لووں میں
ہم اس کے تھے اس کے ہی رہے ناز سے کہنا

کچھ بھید ادھڑتی ہوئی قبروں کی طرح ہیں
دنیا سے چھپائے مرے جاں ساز سے کہنا

اس آتش پیہم سے پگھلتی ہے مری جاں
بارش میں بھی دم گھٹتا ہے دم ساز سے کہنا

یہ راگ تو دیپک ہے سمجھ لو کہ گئے ہم
کومل ہی رکھے سر کو اس آواز سے کہنا

میں جلتے چراغوں کی قطاروں میں ملوں گی
اب تک تری راہوں میں ہوں اعزاز سے کہنا

ہم لوگ تو انجام سے پہلے کا ہیں انجام
کچھ لوگ بچھڑ جاتے ہیں آغاز سے کہنا

کیا چاند چکوری کی کہانی میں سحر ہے؟
سب پنکھ بکھرنے کو ہیں پرواز سے کہنا

آنسو میں گُھل رہا ہے تو کاجل اُتار لو
چاہو تو بارشوں کے یہ بادل اُتار لو

اُس کی نظر نے مُجھ کو نیا پیرہن دیا
پُروائیوں کو دُھن تھی کہ آنچل اُتار لو

دریا چڑھا ہوا تھا مجھے ڈوبنا تو تھا
آواز تم کو دی تھی کہ سانول اُتار لو

آتی ہے گھنگھروؤں کی صدا رات رات بھر
کوئی ہوا کے پاؤں سے پائل اُتار لو

تم پیاس بھر کے لائے تھے خالی گلاس میں
اب پیڑ سے بندھا ہوا گھائیل اُتار لو

صحرا کی خشک ریت میں بکھرا مرا وجود
کاندھے سے اب یہ سوکھتی چھاگل اُتار لو

ٹوٹا طلسم جسم کی دیوار ڈھے گئی
آنکھوں سے میرے خواب کی کونپل اُتار لو

دھونی رُمائے بیٹھے ہو جنگل سجا لیا
کب گیان میں ہے دھیان یہ بھوبل اُتار لو

دیکھا جو آئینہ تو سحر چاند ڈھل گیا
تم دل کی بستیوں میں بھی جنگل اُتار لو

کسی کتاب پرانی میں رکھ کے آتے ہیں
حقیقتوں کو کہانی میں رکھ کے آتے ہیں

یہ کچھ خیال بڑھاپا خراب کر دیں گے
چلو نا ان کو جوانی میں رکھ کے آتے ہیں

تیرے خیال کی مچھلی تڑپ رہی ہے ابھی
اُٹھاؤ اس کو بھی پانی میں رکھ کے آتے ہیں

بڑی تپش ہے تیرے کاٹ دار لہجے میں
تجھے بھی رات سہانی میں رکھ کے آتے ہیں

بس اک ستارہ سا آنسو پلک سے لپٹا ہے
یہ تھم گیا ہے روانی میں رکھ کے آتے ہیں

یہ خشک پھول ہیں خوشبو کہاں سے آئے گی
انہیں تو رات کی رانی میں رکھ کے آتے ہیں

وہ داستان سرائے میں جا کے رہنے لگا
اسے کتاب کہانی میں رکھ کے آتے ہیں

یہ مور پنکھ اُسی نے کبھی دیا تھا سحرؔ
اب اس کو یاد نشانی میں رکھ کے آتے ہیں

دن ہوا اور روشنی ہی نہیں
چاند نکلا تو چاندنی ہی نہیں

بیچ جنگل کے راہ بھولی تھی
لوٹ کر گھر کبھی گئی ہی نہیں

حال اور ماضی ایک جیسے ہیں
وقت سے میری دوستی ہی نہیں

میری آنکھوں کو لے اُڑا بادل
ایسی بارش ہوئی تھمی ہی نہیں

کچھ ستاروں نے خودکشی کر لی
کچھ ستاروں میں سانس تھی ہی نہیں

یہ سحر آئینے میں کون ہے اب
اپنی صورت کبھی ملی ہی نہیں

اب ہمیں ترکِ تعلق کے نئے گہنے دے
اشک کو آنکھ میں حیران پڑا رہنے دے

ہم ترے دل کے مہاجر میں ہمیں حوصلہ دے
آخری بار جو کہنا تھا وہ سب کہنے دے

ندی کو روک سکے گا ڈھلان باندھے گا
سنا ہے اب وہ نئے گر سے بان باندھے گا

چہک پرندے کی کِلکار ننھے بچے کی
وہ اپنے جبر سے سب کی زبان باندھے گا

مجھے نجات دلا دے گا میرے زنداں سے
کچھ اس ادا سے مرے جسم و جان باندھے گا

وہ بارشیں تھیں کہ دھرتی غروب ہونے لگی
یہ ابر اب کے برس آسمان باندھے گا

میں ِگر پڑی تری دستار کے سنبھالنے میں
مری رِدا سے مگر تو مچان باندھے گا

تو نفی ہے تو یہ مثبت سے اشارے کیوں ہیں
برف کے بُت میں محبت کے شرارے کیوں ہیں

تو سمندر تھا تو پھر آنکھ میں سمٹا کیسے
تو فلک ہے تو بتا تیرے کنارے کیوں ہیں

میرے وہ پر جو مجھے لے کر اُڑے جال کی سمت
مجھ سے مخلص نہیں پھر بھی مجھے پیارے کیوں ہیں

دو میں سے ایک کے حصے میں تو آنی تھی شکست
حیرت اس پر ہے کہ دونوں بھلا ہارے کیوں ہیں

اب کے بگڑا ہوا دل یوں تو نہیں بہلے گا
وقت کے ہاتھ میں خوش رنگ غبارے کیوں ہیں

بے حِسی پھول ہے احساس کے پیڑوں کا سحر
پھول سب اُس کے فقط پیڑ ہمارے کیوں ہیں

بنجر نہیں کہ پھول نہ کوئی کھلا سکوں
موسم مگر نہیں ہے کہ میں لہلہا سکوں

سُکھ کا پتہ ملے گا مرے گھر سے کچھ پرے
رستہ بتا سکوں میں وہاں خود نہ جا سکوں

ان آندھیوں سے پوچھ مرا گھر کہاں گیا
مجھ میں سکت نہیں ہے حقیقت بتا سکوں

تو ریت سے بنا ...... کوئی گھر تو مگر بنا
میں خود جو آندھیوں کے بھی رستے میں آ سکوں

اس کے لکھے ہوئے کو میں تقدیر کیوں کہوں
جس کے لکھے ہوئے کو میں خود بھی مٹا سکوں

لکھ تو لیا ہے نام سحر سطح آب پر
اب فکر میں ہوں لہر کی زد سے بچا سکوں

محروم اُس کے قُرب سے اک شام روبرو
پھر زرد چاند رات کا انجام روبرو

بنجر فلک بکھر گیا ویران دشت میں
پرواز آ چلی ہے تہہ دام روبرو

ترکِ تعلقات طلب آخری تری
ہجرت نصیب پھر کوئی گُلفام روبرو

اس عمر کی صلیب پہ ہر سانس بُجھ چلی
تازہ جہاں کے نام سے پھر دام روبرو

جس جا چمک رہا تھا ستارہ سحر کبھی
اک زخم رو رہا ہے سرِ شام روبرو

میری وفائیں پڑی ہوئیں ہیں تیرے رستے رستے میں
تُو نے ہی تو زخم دیئے ہیں مفت میں یا پھر سستے میں

یونہی بس وہ مجھ کو چھوڑ کے سب سے ملتا رہتا ہے
بچہ بھی تو ...... غلط کتابیں ...... رکھ لیتا ہے بستے ہیں

اکثر ان اُڑتے بالوں میں دھول نے موتی ٹانک دیئے
شوخ ہوا نے پھول سجائے ...... آوارہ گل دستے میں

اُس سے بچھڑ کر میں بھی اکثر آسودہ ہو جاتی ہوں
وہ بھی کتنا خوش رہتا ہے روتے اور ترستے میں

بس پھر سارے دن کا رونا ...... اپنے گلے کا ہار ہوا
ایک ذرا سا ذکر کیا تھا کسی نے ہنستے ہنستے میں

جیون میں پت جھڑ اُترا ہے آنکھوں میں باڑ آئی ہے
بارش تھم کر دیکھ رہی ہے گھائل نین برستے میں

دل منہ زور تمناؤں کے نرغے میں یوں رہا سحر
جیسے ایک بزدل سا فوجی لڑے بہادر دستے میں

اک خوشبو کا جھونکا باندھے آنچل کی ہریالی میں
پھول پھول تعمیر کروں میں بس کر ڈالی ڈالی میں

کونپل کھِلنے جیسا دن تھا جب وہ پہلی بار ملا
کوئی فضا سے پھینک رہا تھا کلیاں بھر بھر تھالی میں

اُس کا آنا اُس کا ملنا اب تک مجھ میں باقی ہے
اک سرگوشی جھول رہی ہے آج بھی کان کی بالی میں

کل جب کوئی سارے شہر کو تیری بات بتا دے گا
چڑیا کی چہکار ہنسے گی دو پتوں کی تالی میں

جھونکے جیسا شخص کہیں جو پل بھر نہیں ٹھہرتا تھا
آج سحر وہ قید ہوا ہے من کھِڑکی کی جالی میں

پہلے تو خود اس شخص نے بنیاد بلا دی
پھر کہنے لگا کس نے یہ دیوار گرا دی

اس سال میرے گھر کو بہا لے گئی بارش
اس بار مری فصل بھی سورج نے جلا دی

باتھوں کی لکیروں سے لپٹ کر بڑا روئی
بچپن کی وہ مہندی جو سہیلی نے لگا دی

جس رنگ میں تو نے میری چنزی کو ڈبویا
اُس رنگ نے کیسے میری تقدیر مٹا دی

پتھر میں جسے خون سے میں سینچ رہی ہوں
اس پھول نے کھلنے میں بڑی دیر لگا دی

اب اس کو بلندی کی طرف ڈھونڈ رہی ہوں
ڈھلوان میں جو گیند سحر میں گرا دی

شاعری ہی میری حویلی تھی
اُس کا ہر شعر اک پہیلی تھی

یہ مرے ہاتھ دو کبوتر تھے
اور اک زرد سی ہتھیلی تھی

ان ستاروں میں میرے آنسو تھے
مہرباں شب مری سہیلی تھی

میرے جیسی ہی شکل و صورت تھی
میری قسمت بھی اُس نے لے لی تھی

بے بسی ہی تو میری گڑیا تھی
میری بیٹی بھی اُس سے کھیلی تھی

چاند ہمراہ چل رہا تھا مگر
رات ویران تھی اکیلی تھی

مشکوک اجنبی کوئی سارے گھروں میں ہے
اک بد لحاظ بھید ہے جو منظروں میں ہے

پانی سے دوستی تھی مگر دشمنی بھری
خنجر بکف کوئی نہ کوئی ساگروں میں ہے

سفاک ہاتھ تیر رہے ہیں فضاؤں میں
کٹنے کا خوف اڑتے ہوؤں کے پروں میں ہے

ہم ہیں جو اُٹھ کے چل دیئے ملبوں کے ڈھیر سے
چادر بنی ہوئی ہے جو مٹی سروں میں ہے

کاٹی ہے عمر قید مگر آج بھی سحر
اک قفل شہر ذات کے باروہ دروں میں ہے

معبود تجھ سے ایک جبیں چاہیے مجھے
پھر اس کے بعد کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے

تیرے جہاں پہ اپنا جہاں کیوں میں وار دوں
کوئی بہشت ہے تو یہیں چاہیے مجھے

پرواز کیا کروں کسی بنجر فلک پہ میں
اُڑنے کے واسطے بھی زمیں چاہیے مجھے

دھوکا ملے تو پوری توانائی سے ملے
چھوٹی شکست بھی تو نہیں چاہیے مجھے

ہر روز ٹوٹتے ہیں بھروسے کے آئینے
خنجر بکف یقین نہیں چاہیے مجھے

اب آرزو فلک یا ستارے نہیں رہے
مٹی کی گود کا ہی یقیں چاہیے مجھے

میں کیا کروں کہ میری ضرورت ہیں نفرتیں
اب تو سحر خلوص نہیں چاہیے مجھے

چھین کر کِرنوں سے بینائی اندھیرا کر دیا
اک ذرا سے ابر نے سورج کو اندھا کر دیا

ایک ماتھے کی شکن نے چھین لیں سب شفقتیں
ایک ہی مچھلی نے سارے جل کو گندہ کر دیا

جیتے جی تو زندگی کے چیتھڑے نوچے گئے
مر گیا تو اُس کی خاطر سب نے چندہ کر دیا

اب خوشی اور رنج کا اک عکس تک پڑتا نہیں
شیشہ دل کو نہ جانے کس نے میلا کر دیا

وہ کڑکتی دھوپ لیکن میں گھنی چھاؤں کہوں
اک عجب مفہوم سے لفظوں کا سودا کر دیا

کیوں کھلونے ڈھونڈتے ہیں کھیلنے والا کوئی
کسی نے میرے عہد کے بچوں کو بوڑھا کر دیا

حرف کے پھول چن کے لاتے تھے
روز تازہ غزل سناتے تھے

درد کی بستیوں میں اک گھر تھا
اس کی ویرانیاں سجاتے تھے

زندگی ڈائری میں لکھتے تھے
اور پھر ڈائری جلاتے تھے

اب اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں
پہلے اکثر دیئے جلاتے تھے

اک شجر تھا جو اس کے جیسا تھا
اس کو ہم حال دل سناتے تھے

آنسوؤں میں بھگو کے رکھتے تھے
پھول پت جھڑ میں سوکھ جاتے تھے

اس کے لہجے کی زد میں آتے ہی
کانچ کے خواب ٹوٹ جاتے تھے

زندگی کی گلی میں بھی کچھ لوگ
موت کا گیت ...... گنگناتے تھے

اپنے غم سے کشید کر کے ہنسی
خود ہی اپنا فریب کھاتے تھے

بے نیازی بھی ایک نعمت تھی
یاد کرتے ہی بھول جاتے تھے

زندگی سے کبھی ملی ہو سحر
کچھ بلاوے تو تم کو آتے تھے

اک تعلق کی بدنمائی پر
ہم تھے مجبور بے نوائی پر

سانپ نکلا سنہرے پیکٹ سے
اس کا تحفہ تھا رونمائی پر

طشتری میں طلائی خنجر تھا
لاش دلہن کی تھی چٹائی پر

تم نے گجروں کی بات کی تھی مگر
زخم باندھے میری کلائی پر

گولڈ میڈل اسی کا بنتا تھا
اس کا تھیسس تھا بے وفائی پر

اپنی حالت پہ ہم کو ہنسنا تھا
ایک تقریبِ جگ ہنسائی پر

کانچ کی چوڑیاں بکھرنی تھیں
توڑ ڈالی گئیں کلائی پر

ہم اسیر وفا ہیں یاد رہے
دل نہیں مانتا رہائی پر

بندگی کے نشان پائے سحر
وہ جو مامور تھا خدائی پر

زندگی کی لکیر جانتی تھی
بات لمبی تھی عمر چھوٹی تھی

آج آنچل میں تیرگی باندھی
میں کبھی سورجوں پہ چلتی تھی

کیا پتا کب جدائیاں آ لیں
آئینے میں بھی آج دھمکی تھی

کیوں میں دیوار میں چنی جاتی
جب میں مٹی سے وصل مانگتی تھی

اپنی تنہائی میں مکمل ہوں
میں ترے ساتھ کچھ ادھوری تھی

کیسے بچھڑی ہتھیلیوں سے حنا
آخری چوڑی کیسے ٹوٹی تھی

مرے اس بت میں کوئی رہتا ہے
کب میں چپ چاپ اور اکیلی تھی

رب کی خاموش بارگاہوں میں
آرزو سانس روکے بیٹھی تھی

پھول آنچل میں کیسے رکھ لیتی
میری چنری بہت ہی میلی تھی

اب تو قبروں سے دوستی ہوگی
زندگی مجھ سے جھوٹ بولتی تھی

کیا ملا بے چراغ گھر میں سحر
کیوں تمہیں واپسی کی جلدی تھی

سفر کے سامنے دیوار کر کے
تم اب کیا دیکھتے ہو وار کر کے

تعلق اب تلک توڑا نہیں ہے
پڑا رہنے دیا بیکار کر کے

بس اپنی ضد کا پتھر چاٹتا ہے
خود اپنی زندگی دشوار کر کے

وہ پازیبوں کے گھنگرو گننے والا
سُنے گا کب تلک جھنکار کر کے

دعاؤں میں سحؔر لپٹی رہو گی
کبھی ماں نے کہا تھا پیار کر کے

اشک بار آنکھ سر پھرا آنچل
بھیگی آنکھوں کا آسرا آنچل

جیسے بجلی چمک رہی ہو کہیں
تیز بارش میں دُودھیا آنچل

پھول کھلنے لگے دوپٹے پر
رنگ اوڑھے گا موتیا آنچل

میرا چہرہ چُھپا کے رکھتا ہے
زرد رنگت سے آشنا آنچل

مجھ سے دریا عبور ہو نہ سکا
اور کنارے سے جا لگا آنچل

ڈھول کے رنگ اوڑھ لیتا ہے
چاندنی سے دُھلا ہوا آنچل

رینگتے رینگتے اک روز جو قد میں آیا
ہوش تاراج ہوا عشق کی زد میں آیا

کب جنوں ساز کا انجام خرد میں آیا
کیسا آزاد تھا زنجیر کی حد میں آیا

آئینہ ہنس کے یہ بولا تھا کہ جا آج سے تُو
حُسن والوں میں ہوا حسن کی مد میں آیا

سرخ انگار وہ تلووں کو جلاتی ہوئی ریت
تن جھلستا تھا یا خود پاؤں وجد میں آیا

وصل کے بعد سفر ختم ہو جائیں کہیں
تھم بھر ہجر نبھاتا ہوا ارمان قصد میں آیا

یہ میرے ضعفِ عبادت کا نتیجہ تھا سحرؔ
ایک ہی سجدہ میرے ساتھ ابد تک آیا

مدارِ ہوش سے باہر نکل رہی ہوں میں
حریمِ ذات میں گر کر سنبھل رہی ہوں میں

سمے کی راکھ میں اک کوئلہ سُلگتا ہے
اسی حرارتِ پیہم سے جل رہی ہوں میں

میرے پیالے میں رقصاں ہے موت کا سیّال
یہ زہر ہے جو برابر نگل رہی ہوں میں

یہ معذرت ہے میرے جسمِ ناتواں تجھ سے
میں لا پتہ تھی رہائش بدل رہی ہوں میں

قدم خلاؤں میں تحلیل ہو رہے ہیں میرے
یہ رقص ہجر ہے رسی پہ چل رہی میں

تو آفتاب تھا صدیوں کی برف تھی مجھ میں
ترے غروب سے پہلے پگھل رہی ہوں میں

سمے کی آخری سیڑھی پہ چھوڑنے والے
پلٹ کے دیکھ ترے ساتھ چل رہی ہوں میں

ستارے مشعلیں لے کر رواں دواں ہیں سحر
چراغِ دل کی مگر لو مسل رہی ہوں میں

پنجاب رنگ

اوہ اسمان دا تارہ تے میں موتی ڈونگھے پانی دا
فیر وی سب دنیا توں ودھ کے اک دوجے نوں جانی دا

اوہدے ناں دیاں ساریاں ٹھہناں وار و واری پک گئیاں
ساڈھی واری آوَندیاں آوَندیاں گیند گواچا ہانی دا

واء کئی ورقے تھلدی رہی
اکو کہانی چلدی رہی

سکھاں دا رُکھ ہرا نہ ہویا
دُکھ دی ٹہنی پھلدی رہی

ٹھریا پنڈا سیکن خاطر
ہڈاں دی اگ بلدی رہی

میں سوہنی وچ دکھ دریاواں
کیہ کیہ چھلاں جھلدی رہی

تیری مرضی دی بُکل وچ اپنے سُکھ کفنائے نیں
اپنے پیارے دے کے تیرے قبرستان وسائے نیں

روز میں دُکھاں دی کندھ ڈھاواں خورے فیر اسارے کون
ٹُٹے بھجے چار کو ساہ وی کسے دہاڑی لائے نیں

جسراں ماڑے سوہریاں دے گھر اتھرا جیہا جوائی کوئی
کسے نے چُپ چپیتے دل وچ انج وی پھیرے پائے نیں

جویں سُتے پنڈ وچ کوئی بوہا زور دی کھڑک پوے
ایس طراں ایس جُثے دے اندر دل نے رولے چائے نیں

خورے کیہڑے لوک سی جیہڑے اک خدا نوں مندے رہے
سانوں تے جھلنے پیندے نیں لشکر لکھ خداواں دے

توں ای تے ایس سُکے رُکھ دا کلم کلا پتر سی
توں وی اپنا ہتھ چھڈا کے پھڑ لئے ساتھ ہواواں دے

اک معذور دی ریڑھی وانگوں سدا حیاتی رڑھدی رہی
پیراں کولوں پینڈے گُھس گئے زور گواچے بانہواں دے

کچا رنگ تے کچے تاگے کچی ہر اک تند سحر
چھجدے جاون ہولی ہولی لیڑے دل دیاں چاواں دے

اوہدی آکڑ کچ دی گڈی سانبھ سانبھ کے رکھاں میں
بھورے کر لِتّے نیں اپنے اوہدا مان ودھاون لئی

اوہدیاں پڑھیاں لکھیاں سوچاں، میرے نیں ان پڑھ جیہے چا
دل نوں کیہڑا علم پڑھاواں اوہنوں حال سناون لئی

میں کملی آں

پیٹ اچ سی تے
اوہدے لئی میں
تاہنگاں بھریاں
نظماں لکھدی رہندی ساں
اپنے خواب دی بُکل دے وچ
سدھراں دا اِک شہر لکائی پھردی ساں

گود اِچ آیا
عرشاں دا چن جھولی پایا
اوہنوں تکدی رہندی ساں
اوہ ہسدا سی ہس پیندی ساں

اوہ روندا سی رو پیندی ساں
گلاں کردی رہندی ساں
کھیڈ دا کھیڈ دا میری گود توں لتھ جاندا سی
پچھے پچھے پھردی ساں

وڈا ہویا
ایدھر اودھر ٹُر جاندا سی
میں بوہے دے پٹ جیہی ہو کے
مِٹی دی اِک مورت وانگوں
کِنی کِنی دیر کھلو کے
جیندی مردی رہندی ساں
راہواں تکدی رہندی سی

میرے توں وی اُچا ہو گیا
سر چُک چُک کے تکدی ساں
اکھیاں روکی رکھدی ساں
ربا کوئی نظر نہ لگ جائے
سدا اے میری اکھ دا تارہ
خیر دی پوڑھی چڑھدا جائے

علم کتاباں پڑھدا جائے

جاندا سی، آ جاندا سی
سائیکل توں موٹر سائیکل......
فیر گڈی لے کے
مینوں سارا شہر گھماندا سی
اوسے نے سمجھایا مینوں
اللہ دی ایہہ دنیا کنی سوہنی اے
ہر اِک شے من موہنی اے

خورے فیر کیہ ہویا اوہنوں
اک دن مینوں کلی چھڈ کے
دور پرائے دیساں دے وچ
جا وسیا
اوتھے جا کے
کیویں رویا کیویں ہسیا
کُجھ نہیں دسیا
پردیسی دا جوگ لیا
اینا وڈا روگ لیا

اوتھے اوہنوں ‘‘میری’’ لبھی
کیسی گھمن گھیری لبھی
گھمن گھیری دے وچ پل پل
چکر کھاندا رہندا اے
کدی نہ دَسے دل دے دُکھڑے
درد لکاندا رہندا اے
کلم کلا رو کے اپنا آپ گواندا رہندا اے
لہو رواندا رہندا اے

نہیں دَسدا تے نہ دَسے
پر ماں تے سب کجھ جان دی اے
ماں بچے دا ہر اِک دُکھ پہچاندی اے

کملیاں ماواں آخری ساہ تک
پُتر لبھدیاں رہندیاں نیں
اکھاں وچ اُڈیکاں بھر کے
جیندیاں مردیاں رہندیاں نیں
ایویں ای کردیاں رہندیاں نیں

رب سچا تیرے چارے پاسے
بھر دیوے خوشیاں دے ہاسے
سُکھ جیویں، آباد رہویں
میں وی رہواں گی آسے پاسے
کدی کِتے جے دیس نوں آویں
کملی ماں نوں ویکھ نہ پاویں
دُکھ دی کوئی سوچ نہ رکھیں
ہسیں کھیڈیں خوش وسیں
میری یاد اچ
میرے بچے
مِٹی دی نہ ڈھیری لبھیں
کدی نہ گھمن گھیری لبھیں

قطعات

ایک تابوت مرے قد کے برابر بھیجا
ساتھ اک مرتا ہوا زخمی کبوتر بھیجا
اُس سے نفرت بھی نہ ہو پائی محبت کی طرح
اُس نے ہر جذبہ مرے رتبے سے کم تر بھیجا

……☆……

جدھر گیا ہے وہ سب کو اُدھر ہی جانا ہے
جو جی رہے ہیں انھیں بھی تو مر ہی جانا ہے
ذرا سے بوجھ سے زنجیرِ عدل ٹوٹ گئی
یہ منصفی کا ہنر تھا ہنر ہی جانا ہے

متفرق اشعار

وہ آسمان سے اُترا تو پانیوں پہ چلا
سُنا ہے چاند سمندر کو آزمانے لگا

……☆……

دل مالِ غنیمت ہوا یلغار سے پہلے
تم جیت گئے کیسے میری ہار سے پہلے

……☆……

موسمِ گل میں پھول کھلتے ہیں
اُن میں اک زرد پھول میں بھی ہوں

……☆……

حال ماضی کی طرف دوڑ گیا ریل کے ساتھ
اب سٹیشن پہ کھڑا ہاتھ ہلاتا ہوگا

……☆……

مٹی جنونِ رقص میں رندوں سے جا ملی
اونچی اُڑان والے پرندوں سے جا ملی
اندیشے خوف پہن کے بیٹھے رہے سحر
ہرنی خود اپنے آپ درندوں سے جا ملی

……☆……

لوگ جو کہہ رہے ہیں کہنے دے
اب مجھے مرے ساتھ رہنے دے

……☆……

کِس اُداسی کے ساتھ بہتی ہے
زندگی بانسری میں رہتی ہے

……☆……

عین ممکن ہے کہ آوازیں خلاؤں سے ملیں
جس طرح بچھڑی ہوئی بچیاں ماؤں سے ملیں

……☆……

یا خدا

دھوپ میں جا کے
کرنوں سے جھولی بھری بارہا
آ کے کمرے میں دیکھا
تو کچھ نہ ملا
تیرگی کے سِوا
اب مگر عزم کا ہر دیا بجھ گیا
صرف ہونٹوں پر حرفِ دعا جم گیا
میرے کمرے کے تاریک ٹھنڈے
دُکھوں کو مِٹا
یا خدا!
یا خدا!!

ابو جی

ہوا نے آپ سے جب اپنا رشتہ توڑ لیا
میں سانس لیتے ہوئے
خود غرض سی لگتی ہوں
یہ لوگ درد سے عاری
بغیر خون کے لوگ
یہ لوگ
آپ کو
زیرِ زمیں لٹا آئے
مجھے زمین پہ چلنا عجیب لگتا ہے

ایک اور آخری دن

ان پڑھ
جاہل
گھامڑ عورت
تیرے ساتھ اب ایک بھی پل
میں نہیں رہوں گا
ابھی خریدوں گا اشٹام اور
آج ہی ہو گی لکھت پڑھت سب
آج یہ قصّہ
ختم سمجھ لے
تیرے بعد تو جو بھی آئی

تجھ سے زیادہ بہتر ہو گی

میرے ساتھ یہ

آج ترا

بس آخری دن ہے......

میرے ابو

اس دنیا کے سب سے اچھے ابو ہیں

لیکن آج

ذرا غصے میں تھے

تو نے......

ارے! تو نے

میرے سارے قیمتی کاغذ اور کتابیں

ردّی والے کو

دے ڈالیں

آج تُو خمیازہ بھگتے گی

چل......

بچی کو ساتھ میں لے

اور

میرے پیچھے چلتی آ

ماں نے اپنا برقع پہنا

پھر

میرے ننھے پیروں میں
اونچی ایڑی والی ٹپ ٹپ کرتی
جھلمل سی جوتی پہنائی
میری اُنگلی کو تھاما

اور

ابو کے پیچھے پیچھے چل دی

تیز قدم ابو

اور ان کے پیچھے
آنسو پونچھتی
سُست روی سے چلتی ماں

امی!

آج کہاں جائیں گے؟
(میں نے ڈری ڈری مدّھم سی خوشی سے پوچھا)
کیا ہم سیر کو جائیں گے؟
آج تو
ہم بھی سیر کریں گے
ہے ناں امّی!
کہاں بھلا؟
جلدی جلدی چلو ناں امی
ابو غصے ہو جائیں گے

واپس گھر لے جائیں گے
دیکھو
ہم سے کتنا آگے نکل گئے ہیں ابو

دیکھو دیکھو
رُکو نا امی
یہ دیکھو
ہر مال ملے گا بارہ آنے میں ’’والا بابا‘‘
امی
اس کے پاس ہے مانگ کا ٹیکا
کتنا اچھا کتنا پیارا
امّی
پیسے ہیں نہ امی......؟
امی! میں ٹیکا پہنوں گی
مجھ کو ٹیکا لے دو ناں
اچھی سی میری پیاری امی
لے دو ناں
ماں نے تھوڑے سِکے گن کر
دیے اسے
اور پھر

ہر مال سے ٹیکا لے دیا مجھ کو

افو وہ……
اتنی دیر
ابو غصے سے پلٹے
امی
میرے ماتھے پر وہ مانگ کا ٹیکا سجا رہی تھیں
میں اپنے ٹیکے کی جھل مل
دونوں ہاتھوں سے
چھو کر
دور سے بولی
ابو
دیکھو
ابو، ابو
اچھا ہے ناں……؟
ہے نا ابو؟

ابو سارا منظر خاموشی سے دیکھ رہے تھے
پھر وہ ہمارے پاس آئے
ماں …… میرا ماتھا چوم رہی تھی

ہاں! میری بٹیا
بہت اچھا ہے
اور پھر ……
نادِم نادِم
آہستہ سے جُھک کر بولے

چل شانو کی ماں
گھر چلتے ہیں

لکھی میّا موری

ماں
جب میں چھوٹی تھی
مجھے پرایا دھن کہہ کہہ کر
تو روتی تھی
مجھ سے بچھڑ جانے کا صدمہ
تیرے چہرے پر لکھا تھا

میں نے تیرے
ہر آنسو کی بات سنی

اور ترے پیارے چہرے سے

ایسی ہر تحریر مٹا دی

جس میں میری
تجھ سے جدائی لکھی ہوئی تھی

دیکھ لے میں نے
تیرے ساتھ کو امر بنا لینے کی دھن میں
اپنی ہنستی بولتی بانہیں گونگی کر لی ہیں
اور عمر بتانے تیرے آنگن سے لپٹی ہوں
بیت رہی ہوں
لیکن ماں
اب تیرے پیارے بالوں کی خاموش سفیدی
مجھے ڈراتی رہتی ہے
اب تجھ سے بچھڑ جانے کا دھڑکا میرے چہرے پر لکھا ہے
تیرا اک اک آنسو میّا میری آنکھوں سے جاری ہے

ماں
اب تیری باری ہے

تو بھی میرے ماتھے سے
وہ سطر مٹا

جس میں میری
تجھ سے جدائی لکھی ہوئی ہے

فاصلے اور فیصلے

بھیتر کی بے کار ضدوں کو
بھیتر ہی دفنا آئی ہوں
دل کے ضدی بالک کو بھی
سختی سے سمجھا آئی ہوں
لوٹ کے واپس آئی ہوں تو بھول گئی ہوں
کہاں گیا گھر آنگن میرا
کہاں ہے میرا رین بسیرا
میرے دونوں بے بس پاؤں
راہ نہ پوچھیں
خاموشی سے

چلتے جائیں
تھکتے جائیں
سمجھ گئے ہیں
وہاں……
جہاں سورج ڈوبے لگا
وہیں تلک ہے
جوگی والا بیکل پھیرا
وہیں ہے جیون رین بسیرا

تدبیر

آنسوؤں کے ریلے میں
ایک چیخ گریہ کی
قہقہوں کا اک طوفاں
ایک دھاڑ غصے کی
چارہ گر!
بتاؤ، تو
کیا کروں
کہ سینے میں
سانس کی سہولت ہو
درد کی دکھن کم ہو
کچھ تو یہ گھٹن کم ہو

کسیرا بازار

بجلی پنکھا ریڈیو
جیسی عیاشی
تو
نہیں تھی گھر میں
گرمی تھی اور
بڑی قیامت کی گرمی تھی
ماں
اپنے آنچل کو بھگوتی اور مجھ پر پھیلا دیتی تھی
پھر
اپنے ان تھک ہاتھوں سے

پنکھا جھلتی رہتی تھی
وہ میرے بچپن کے دن تھے
جب میں بہت بیمار پڑی تھی
اور علاج
بہت مہنگا تھا
ابو کا اک اک پیسہ
میری بیماری چاٹ چکی تھی
اور اب امی کے زیور بھی
بکنے لگے تھے
امی کے زیور ہی کیا تھے
کچھ تانبے کچھ پیتل کے چمکیلے برتن
گھر میں سجے ہوئے وہ جھلمل برتن

چھوٹی سینیاں ...... بڑی سی سینیاں
دیگچیاں جگ......
اور گلاس......
بڑی سی پیتل کی گاگر تھی
گڑوی، لوٹا، پاندان
نقشین کٹورے
عطر دان گلدان

پراتیں اور رکابیاں
چند صراحیاں
یہ سب برتن
ماں کو اپنے زیور جیسے ہی لگتے تھے
پھر وہ گھر کے زیور سارے
تھوڑے تھوڑے لے جاتے تھے
اور بازار میں جا کر بیچ آتے تھے
اتنے سارے برتن دے کر
انجیکشن اور گولیاں کیپسول آ جاتے تھے

اس بازار کا نام کسیرا تھا
وہاں تو
پیتل اور تانبے کے
ڈھیروں برتن
اس بازار کی زینت تھے
رفتہ رفتہ
برتن تو سب بک گئے
لیکن
وہ سب برتن
نوٹ اور سکے بن کر

میری جان بچا لائے تھے
بیماری کی جنگ میں میرے
امی ابو جیت چکے تھے
ان کی محبت اور محنت سے
دکھ کے موسم بیت چکے تھے
ان کی دعائیں
موت کے گھر سے میرا
بنستا کھیلتا جیون
واپس لے آئی تھیں
آج مگر جب
عمر کی ڈھلوانوں پر آ کے
میں پھر سے بیمار پڑی ہوں
آج میرے گھر میں سب کچھ ہے
مہنگے سے مہنگے انجیکشن
اور دوائیں
اچھے سے اچھے ڈاکٹر
بچوں کی دعائیں
ٹھنڈے گرم کے سارے ہی سُکھ
جو چاہوں
سب مل جاتا ہے

لیکن
صحت انکاری ہے......
بیماری ہے
جوان سارے سُکھوں پہ بھاری ہے
اب میں ٹھیک نہیں ہو سکتی
شاید
اب ماں باپ نہیں ہیں
آج اگر
وہ زندہ ہوتے
روٹھے رب کو منا سکتے تھے
میری جان بچا سکتے تھے
وہ تو
میری صحت
کسیرے سے بھی لا سکتے تھے
یہ تو بس ان کو ہی پتہ تھا
پیتل تانبے کے بدلے میں
سونا کیسے مل جاتا ہے
گھر کے خالی آنگن میں بھی
جیون کیسے کھل جاتا ہے
لیکن
اب ماں باپ نہیں ہیں

سیکنڈ ہینڈ

دن بھر کی سانسوں کو مجھ سے
چھین لیا
پھر مجھے ہراساں چھوڑ گیا
آج کا دن بھی
کل جیسا تھا

مشغلہ

اس کا سُکھ بھی کترن کترن
میرا چین بھی
دھجی دھجی ہوا پڑا ہے
ہم دونوں ہی
اک دوجے کی خاطر ملکر
اپنے سُکھوں کے پُرزے چن کر
ڈھونڈ ڈھونڈ کر
جوڑ جوڑ کر
گھنٹوں سیتے رہتے ہیں
لیکن
بِن دھاگے کی سُوئی سے

نمی دانم چہ منزل بود

ڈھلتی عمر کی چادر کو
چہرے سے ہٹا کر
سمے کا پہیہ اُلٹا دوڑا
سارے منظر
واپس بھاگے
رکو ذرا
بس اس منزل پر
گاڑی روکو

دور کسی گھر کے فرشوں پر

وقت کا چہرہ
ہانپ رہا ہے
لمحہ لمحہ
کانپ رہا ہے

اب کی بار تو گیند کو میں
گرنے نہیں دوں گی
پورے سو ٹھپے کر کے چھوڑوں گی

گیند اُچھلی
اور
سیدھی
ابو کی ٹیبل پر چڑھ بیٹھی
ایک کتاب گری وہاں سے
اور اُس میں سے
اک تصویر گری
مرے ابو کی تصویر تھی وہ
لیکن اُن کے ساتھ میں کوئی
اور ہی لڑکی ......بیٹھی تھی
کون ہے یہ؟؟؟

میں سرپٹ بھاگی ماں کے پاس
گئی کچن میں
امی
ابو کو تو دیکھو
ان کے ساتھ کوئی لڑکی بیٹھی ہے
امی نے تصویر کو لیکر......
واپس اُسی کتاب میں رکھا
اور پھر اُلٹا مجھی کو ڈانٹا

چمٹے سے ماروں گی
اب جو تجھ کو
اپنے ابو کی
چیزوں میں
گھُستے دیکھا

لیکن ماں
یہ......؟؟؟
ابو کے ساتھ جو بیٹھی ہوئی ہے
اس......تصویر میں

کون ہے ...... یہ؟؟؟؟
اور میرے ابو کے ساتھ
یہ کیوں بیٹھی ہے؟؟؟

اچھا

یہ......
پگلی یہ تو میں بیٹھی ہوں
نہیں نہیں ماں
یہ تو کوئی اور ہی ہے......
تم کیسے ہو سکتی ہو

دیکھو!
غور سے دیکھوں ناں ماں

کہا نا تم سے
یہ میں ہی ہوں
پہلے میں
ایسی دِکھتی تھی

حیرت سے میں دیکھتی رہ گئی

اچھا؟
ایسی تھیں میری امی ......
پہلے ایسی دکھتی تھیں
میں سوچ میں پڑ گئی

اگلے دن
پھر سے
تصویر نکال کے لے لائی میں
اور اپنے ابو کو دکھائی

ابو جی......
امی کہتی ہیں
یہ اُن کی تصویر ہے
اور
پہلے وہ
ایسی دکھتی تھیں
ابو......!
پہلے امی سندر تھیں یا اب مری امی سندر ہیں
ابو تھوڑا چُپ سے ہو گئے
کچھ نہیں بولے

میں نے پھر پوچھا......تو بولے
پہلے اس تصویر میں اچھی نہیں تھیں وہ
لیکن
اب
سندر لگتی ہیں
یہ کہہ کر ابو نے
تصویر کو مجھ سے لے کر پھاڑ دیا تھا

کہنے لگے
شام کو میں جلدی آؤں گا
پھر ہم تینوں جائیں گے
ایک نیا فوٹو بنوا کر لائیں گے
جس میں ہم تینوں ہوں گے
اور
تمھاری امی
جیسی ہے
وہ ویسی نظر بھی آئے گی

اُس دن جب تصویر بنی تو

ہم تینوں ہی کتنے خوش تھے
بس مسکان تھی چہروں پر
ایک امر لمحہ
جو کمرے کی ٹیبل پر
جگمگ جگمگ کرتا تھا

وہ بچپن تو دور کہیں
گم گشتہ ویرانوں میں
جا کر
چھپا ہوا ہے
امی ابو جانے کس دنیا میں چلے گئے ہیں
خالی گھر ہے
سارے ہنستے بولتے لمحے
اپنا چہرہ کھو بیٹھے ہیں
سائے ہیں جو
حیرت سے
دم سادھے چُپ چاپ پڑے ہیں
ٹیبل پر رکھی تصویر نے
برسوں کی
مٹی اوڑھی ہے

کیا ممکن ہے
اس منظر سے دھول ہٹا کر
وقت ہمیں آزاد کرے
اس گھر کو پھر آباد کرے

سیٹی بج گئی
گاڑی اب
پوری رفتار سے بھاگ پڑی ہے
لیکن
اُس منزل میں
چھوٹے سے اُس گھر کے اندر
وہیں کہیں میں
اپنی آنکھیں بھول آئی ہوں

گواہی

آج کی شام کا ٹھنڈا ٹھنڈا نیلا موتی
وقت کی ڈھلوانوں پر پل بھر
بھاگتے بھاگتے
ٹھہر گیا تھا
میں نے خود چھو کر دیکھا تھا

زندہ رہنے کی خواہش

دانے تک
جب پہنچی چڑیا
جال میں تھی
زندہ رہنے کی خواہش نے
مار دیا

پاگل لڑکی

میں بھی
تیرے جیسی باتیں کرتی تھی
ان ہونی کے ہو جانے کا
تیری طرح مجھ کو بھی یقین تھا
میں نے بھی کچھ انگاروں کو
پھول سمجھنا چاہا تھا
انگاروں کو پھول سمجھنا اور بات ہے
میں تو
ان شعلوں سے
اپنے

گجرے گوندھنے بیٹھی تھی
دیکھ لے
میری باہیں مجھ کو
اب تک طعنے دیتی ہیں

مالک

تو نے
میری مانگ میں
آخر ایسا کیا لکھا ہے
جس کو میری ان پڑھ ماں
پڑھ پڑھ کر روتی رہتی ہے

ریسپشنسٹ

ہر طرف میری شبیہ
ہر طرف میرا ہی عکس
میرے چاروں اور دنیا بھر کی آنکھیں
میرے ہر ہر زاویے کو مشتہر کرتی ہوئیں
آسماں کی سمت دیکھوں
تو ستارے
اپنی اپنی پُتلیوں میں
چھین لیتے ہیں مجھے
میں جو نظریں بھی جُھکاؤں تو
زمیں کا ذرہ ذرہ

گھورنے لگتا ہے وحشت سے مجھے
ساری دنیا کی نگاہیں
تیز تلواریں
جو میری روح کو
میرے بدن کو کاٹتی ہیں
اتنی تیزی سے کہ میں گرتی نہیں
لیکن اس سب کچھ سے بڑھ کر
اک اذیت اور ہے
میرا خود اپنی ہی جانب دیکھنا
کتنا کٹھن ہے
کس قدر تکلیف دہ احساس ہے
میں بھلا اپنی طرف دیکھے بغیر
کتنے دِن زندہ رہوں گی
میں......
کہ جو بس آئینوں ہی آئینوں کے درمیاں ہوں

......

بھرم

اپنے تن کے کپڑوں پر
کتنا دھیان دیتی ہوں
بال بھی بناتی ہوں
اور مسکراتی ہوں
کیا کسی طرح سے اب
میں اُداس لگتی ہوں

میں دکھ دریا کی سوہنی

میں دُکھ دریا کی سوہنی
خوشیوں کا موہوم تصور کچا گھڑا
دریا کے اس پار میرا مہینوال بھی ہے
لیکن
میں تنہا ڈوبوں گی

میرے پیا گئے رنگون

چھٹی والا دن ہوتا تھا
میں، ابو
اور ابو کے پالے ہوئے کبوتر
خوب کھیلتے
اگلے دن جب ابو اپنے دفتر جاتے
ایک کبوتر
اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ کر لے جاتے تھے

اور پھر جب کچھ دیر گزرتی
وہی کبوتر
گھر کی منڈیر پہ واپس اُڑ کر آ جاتا تھا
ماں یک دم خوش ہو کر

کہتی تھی
لے شانو
تیرے ابا دفتر پہنچ گئے ہیں

کیسے پتہ چلا ہے امی؟
روز بھلا
یہ کیسے تم کو
ابو کی خبریں ملتی ہیں؟

یہ جو کبوتر آیا ہے ناں
امی سبزی کاٹتے کاٹتے مسکاتیں
''اس'' نے بتایا
یہی تو ہے تیرے ابو جان کا ٹیلی فون
ماں کی آنکھوں کے تارے
کچھ اور بھی سندر ہو جاتے تھے

تو جب اپنے گھر جائے گی
وہاں بھی ایک کبوتر
روز آئے گا

سچی ماں؟
ہر روز آئے گا؟
ہاں، ہر روز آئے گا

دن بیتے
میں اپنے گھر آنگن میں
آن بسی تھی
جب بھی
وہ جانے والا گھر سے جاتا تھا
اکثر
دیر سے ہی آتا تھا
کبھی کبھی تو پوری رات نہیں آتا تھا
میں سمجھاتی
دیکھو واپس گھر آ جانا
ایک کبوتر بھی
جب اڑتا ہے تو
شام کو سیدھا
اپنی ہی چھتری پر لوٹ کے آتا ہے
آخر شام کو تم اپنے گھر
کیوں نہیں آتے؟

لیکن اب تو
گھر آنے کے سارے رستے
مدت سے ویران پڑے ہیں
دیواریں اور دروازے سب
چپ ہیں
اور حیران کھڑے ہیں

مدت بیتی
نہ ہی وہ خود واپس آیا
اور نہ ہی کوئی
قاصد
سُکھ کا سندیسہ لایا

سورج روز نکل آتا ہے
یادوں کے ویرانوں میں پھیلی
دھوپ اکثر سوچوں کو سنہرا کر دیتی ہے
لیکن پھر وہ
دکھ کو گہرا
اور بھی گہرا کر دیتی ہے

سارے گھر میں
گھور اندھیرا بھر دیتی ہے

ماں کہتی ہے
گھبرانے رونے غم کھانے سے
بہتر ہے
تم صبر کرو
ایک نہ اک دن سب اچھا ہو جائے گا
جتنا سندر دکھتا ہے وہ
دل بھی اُس کا ویسا سندر ہو جائے گا

ماں...... وہ اُجلا
اور سنہرا پنچھی
شو کمار بٹالوی والا
شکرا تھا
لیکن تم کیسے سمجھو گی
ماں
تم نے تو شکرا پڑھی نہیں ہے
میں نے خود پر
جھیلی ہے

گَھلّہ

پتھر کلیجوں والیوں
اپنی بقا کے واسطے
تم احتیاطاً
کانچ کے ساجن بناتی ہو
مگر
ان کے بھی ہاتھوں ٹوٹ جاتی ہو

نصیحت

پھول جیسی بچی سُن
بچپنا بتاتے ہی
جلد بوڑھی ہو جانا
بس اسی میں عزت ہے
بس اسی میں عظمت ہے

ایک سوال

میری اک پھونک بجھا سکتی ہے جلتا سورج
چاند تارے میرے بچوں کے کھلونے ٹھہرے
آسماں نیلی زمیں ہے مرے قدموں کے لیے
میری ٹھوکر سے اڑیں روئی کی مانند پہاڑ
میں جو چاہوں تو سمندر میری مٹھی میں سمٹ کر آ جائیں
میں کہ جس چیز کو بھی چاہوں مسخر کر لوں
میں کہ مخلوق جو اشرف ٹھہری
کوئی آئے گا بھلا میری بڑائی کے مقابل کیسے
میں کہ برتر ہوں

قوی تر ہوں
بہت ارفع ہوں
پر مری بھوک؟
میرے قد سے بھی اونچی کیوں ہے......؟؟؟

میرا بچہ

وہ میرے اشکوں سے
کتنے سارے
نئے ستارے بنا رہا تھا
مرے لیے
اک عظیم چُنری سجا رہا تھا
محبتوں کو
نئے معانی سکھا رہا تھا

تعبیر

ماں
تو مجھ کو چاند بلاتی تھی
پھول سمجھتی تھی
میرے من میں خار چھبے ہیں
میرا آنچل دھول ہی دھول
تیری بیٹی چاند نہ پھول

کرماں ماری

ابھی ابھی
میں پھر
اس محفل سے اُٹھ
بھاگی ہوں
جس میں
رفو، زاہدہ، عرشی، ٹیبی
میرے
لہنگے پر چمپا گوٹا لگا رہی ہیں
میرے ہاتھوں پر مہندی
اور

میرے ماتھے
مانگ کا ٹیکہ سجا رہی ہیں
بابل کی دعائیں لیتی جا
گاتی جاتی ہیں
دیکھو
میری چوڑیاں دیکھو
ساتھ تمہارے
وہ بھی کچھ
گنگنا رہی ہیں

لیکن یہ سب
کیا ہے آخر
کیا تم کو کچھ خبر نہیں ہے
اس سے آگے
آگ کا دریا
کیسے ٹھاٹھیں مار رہا ہے
مجھے یہاں سے لے جاؤ اب
قبل اس کے
یہ گیت تمھارے
چیخیں ماریں

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں سب
اور
ذرا تم رکو
بتاؤ
کہاں چلی ہو
کیا تم تک آوازیں میری پہنچ رہی ہیں
سنو
میری آواز تو سن لو
مجھے بھی ساتھ میں لے کر جاؤ
مجھے اکیلا چھوڑ کے
ایسے
کیسے تم سب جا سکتی ہو
واپس آؤ
آ جاؤ ناں

کم از کم یہ گیت تمہارے
اپنے ساتھ ہی لیتی جاؤ
دیکھو یہ آوازیں میری
جاں لے لے لیں گی

تم اپنی
آوازیں چھوڑ کے چلی گئی ہو
یہ آوازیں تو
بالکل پاگل کر دیتی ہیں
اور
گوٹا کرن بھرے دوپٹے سے
آنسو صاف کرو تو آنکھیں
اور سپنے
سب چھل جاتے ہیں
ہونٹ سدا کو سل جاتے ہیں
اوپر سے
تمہاری
آوازیں ہیں

سنو......
یہ تم سب
آخر اتنا
ہنستی کیوں ہو؟؟؟

تقسیم

کب تلک سنبھلے گا آخر
شاخ سے اپنا گلاب
چُھٹ ہی جائے گا
بدن کا ساتھ
اک دن زندگی کے ہاتھ سے
ہاتھ چھوٹے ہیں ہمیشہ
ساتھ ٹوٹے ہیں سدا
جسم کا ٹکڑا ہے لیکن
جسم سے کٹ جائے گا
وہ مرے حصے میں ہے
پھر بھی
غلط بٹ جائے گا

خدا کی نظروں سے گر گئے جو

(سانحہ پشاور کے بے گناہ معصوم شہید بچوں کے نام)

مرے وطن
میری بے بس اُداس دھرتی
مرے پشاور کے نونہال آج
اپنی ماؤں کی گود کو چھوڑ
تیری گودی میں چھپ گئے ہیں
وہ ڈر گئے ہیں
بڑے ہی سفاک بے رحم لوگ ہیں
جو خدا کی بستی میں
ماؤں کے دل کچل رہے ہیں
وہ اپنے بوٹوں سے

کھلتے پھولوں کی کیاریوں کو مسل رہے ہیں
بڑے ہی معصوم ننھے دل ہیں
مگر دراڑیں
جوان میں آئیں بہت بڑی ہیں
سوال بن کر
قدم قدم راہ روکے ہوئے کھڑی ہیں
کہو ہمارا قصور کیا تھا
کہو ہمارا قصور کیا تھا

سنو
تمہارے لیے یہاں اب
کہیں بھی جائے پناہ نہیں ہے
نہ تم کو مٹی پناہ دے گی
نہ آسماں ہی مدد کرے گا
کہ چھوٹے بچے شہید کر کے
زمین اور آسماں کی نظروں سے گر گئے ہو
یہ تم ہو جو آج مر گئے ہو
تمہی ہو جو آج مر گئے ہو

ماں

مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ
ماں ذرا بازار تک
سودا سلف لینے گئی ہے
لیکن وہ آ، کیوں نہیں رہیں

شاید داتا صاحب کی حاضری کے لیے چلی گئی ہوں

یا
شاید اس سے بھی آگے
ممکن ہے

پیر مکی صاحب کے مزار پر
ایسے ہی بچپن میں ستاتی تھی نہ تم مجھے

لیکن ماں
تم سے خفا ہونے سے
میرا دل ڈوبتا تھا
یاد کرو
جب تم مار مار کے مجھے نہلاتی تھی......
تو میں امی امی کی ہی رٹ لگائے
کتنا روتی تھی
پھر تم میرے لمبے بال کھینچ کھینچ کر میری دو چوٹیاں
بنا دیتی تھیں تو
تمھیں ہنسانے کے لیے
میں گایا کرتی تھی
مائے میریئے نی مینوں بڑا چا...... تے دو گتاں کر میریاں......
لیکن قسم سے دکھتا تھا
ماں میں تم سے بہت پیار کرتی تھی
تمھی سے
لپٹ جاتی تھی......
تمھی سے پوچھتی تھی

اچھی لگ رہی ہوں ناں
تم ہنستی تھیں

ہاں میری پری
میری دنیا کی سب سے اچھی بیٹی
آ جاؤ نہ اماں جانو...... دل گھبرا رہا ہے بہت
دیکھو میں کتنی اچھی بیٹی تھی نا
بتاؤ......کبھی تم سے پوچھے بنا...... کچھ کیا میں نے؟
مگر......
تم نے کیا کیا
مجھے بتائے بنا ہی چلی گئی ہو
......ایک مزے کی بات بتاؤں
مدت سے اب میں خود بھی امی ہوں
لیکن تم تو تم ہو نہ ماں......
مجھے معلوم ہے جب میں بے ہوش تھی ماں......
میرا بازو ٹوٹ گیا تھا
تم نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا تھا
آج میرے سارے ہی دُکھ اکیلے ہیں ماں
تم آ جاتیں
تو میں بالکل ٹھیک ہو جاتی......

دیکھو میں کتنی بیمار ہوگئی ہوں
ماں یہ ابو کو دیکھا تم نے......
جانے کہاں کہاں پر
ادھر سے اُدھر
برآمدوں میں گھومتے رہتے ہیں
مجھ سے اس قدر دور دور......
میں بلاتی ہوں
تب بھی وہ چپ ہی رہتے ہیں......
بس دیکھتے ہیں......لیکن رکتے نہیں ہیں میرے پاس......
ان کو تو ذرا سمجھائیں
کوئی ایسے تو نہیں کرتا ناں اپنی بیٹی کے ساتھ
تمھیں تو پتہ ہے نہ
میری اُن سے، تم سے بھی زیادہ دوستی تھی
پھر وہ ایسے کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ
امی
کچھ،
بلکہ بہت کچھ
کہے سنے بنا ہی بیت گیا ہے ہمارے بیچ
اور بیت رہا ہے
بس ماں

آ جاؤ اب ...... نیند بھی آ رہی ہے

ماں......!

میں سو جاؤں؟
دیکھو تھکن سے چور ہو گئی ہوں

اپنی گود کرو نہ ادھر......

اور ہاں ایک

وعدہ کرو

......پکا......
جب میں آنکھیں کھولوں گی......تو میرے پاس ہی ملنا
پلیز ماں ...... پلیز
پلیز......

رائیگاں ریاضتیں

پتھر سے شہکار نکالنے والو
دیکھو
شہکاروں سے پتھر نکلے

خواہش خون بلوئے

تن کے سرخ سمندر اندر
کتنے سارے دیئے جلے ہیں
ننھے منھے لاکھوں موتی میرے لہو میں ناچ رہے ہیں
جھل مل کرتے کئی فرشتے میری نسوں میں دوڑ رہے ہیں
میں آنکھوں پر ممتا باندھے
سیپ سیپ میں گود بچھائے ڈھونڈ رہی ہوں
شاید لعل کوئی ہاتھ آئے

خود سے بچھڑی ہوئی لڑکیاں

‘‘اونلی فار مین’’ پرفیوم
اپنے تن میں بسا کر
شرٹ اور جین میں
خو کو ملبوس رکھنے لگیں
سگرٹوں کے دھوئیں میں
چھپائے ہوئے اپنے ٹھنڈے بدن
خود سے بچھڑی ہوئی لڑکیاں
اپنی ہی ذات سے منحرف ہو گئیں
اور اگر ......
زندگی کے کسی موڑ پر

خود کو عورت کہا
تو دعا مانگ کر
کہ وہ اپنے بطن سے فقط
مرد ہی جن سکیں

ڈراپ سین

میں اور وہ
دونوں ہی اک ڈرامے کے کردار تھے
وہ ڈرامہ
جو سوچا نہ سمجھا گیا
جیسے کچھ اُلٹی سیدھی لکیریں بناتے ہوئے
ایک تصویر سی
آپ ہی بن گئی
اور مبہم لکیروں کی دہلیز پر
ایک مفہوم آ کر کھڑا ہو گیا
کیسے پردہ اُٹھا

وہ بھی میری طرح کچھ نہیں جانتا
ایک ہیرو اور اک ہیروئن کی طرح
رول کرنا تھا دونوں کو
لیکن خدا جانے کیوں کر ہوا
وہ ولن بن گیا
خود مرا حال بھی ویمپ جیسا ہی تھا

اُلٹی سیدھی لکیروں میں تصویر گم ہو گئی
وہ جو مفہوم تھا
اُلجھے اُلجھے سوالوں کی دہلیز سے بھی پرے
جا چھپا
جیسے کچھ بھی نہ تھا
چند بچوں کی آہ و بکا کے سوا

نہ کر میریاں مینڈھیاں مائے

آل مال پہلا تھال
ماں مری دے لمے وال

لمبے اور پھر گھونگر والے
آج بھی میری یادوں میں ہیں
ماں کے وہ گھنگور سے بال
میں ان کے بالوں سے کھیلتی کھیلتی
ضد کرتی تھی
امی میرے بال بھی ایسے کر دو
امی بھلا یہ کیسے بال ہیں

بالکل موہے بھول گئے سانوریا والی لڑکی جیسے
میرے بال تو سیدھے ہیں
کیوں سیدھے ہیں
بولو امی کیوں سیدھے ہیں؟؟
میرے بال بھی اپنی جیسے کر دو نا
ان کو گھونگر کر دو ناں
امی پیاری
میرے بال بھی
گھونگر گھونگر کر دو ناں

اور
پھر
اک دن
ماں نے
کئی گھنٹوں کی محنت کر کے
میرے بالوں کی
بہت زیادہ مینڈھیاں کر دیں
اتنی ساری مینڈھیاں امی؟؟

کل جب تم صبح اُٹھو گی

بال تمہارے گھونگر گھونگر ہو جائیں گے
کیا بالکل ایسے
میں نے خوشی سے ماں کی لٹ کو چوم کے پوچھا
ان سے بھی اچھے
نہیں نہیں
ان سے اچھے نہیں ناں ماں
بس بالکل ایسے

اگلے دن جب مینڈھیاں کھولیں
میرے بال بھی ماں جیسے تھے
آہا آہا
گھونگر گھونگر
ہو گئے بال
بالکل
موہے بھول گئے سانوریا والی لڑکی جیسے گھونگر بال
دیکھو ابو
بالکل امی جیسی دِکھتی ہوں ناں
ان جیسی کہ ان سے اچھی؟؟؟
بولو ابو
تم تو سب سے سندر ہو

امی سے بھی سندر ہوں کیا؟
ابو بولے
تھوڑی سی کم
بس اتنی سی

آہا آہا بس اتنی سی سندر امی
بس اتنی سی پیاری امی
میں سندر تم پیاری امی
بس تھوڑی سی پیاری امی

آج وہ سب کچھ خواب ہوا ہے

ماں
دیکھو ناں
آنکھوں میں
یہ کیسی
اک فلم سی چلتی رہتی ہے
یادوں کے دھندلے آنگن میں
آج بھی تم اور ابو
دونوں ہی

موجود ہیں جیسے
کچھ ہنستی آوازیں ہیں
اور کچھ
میٹھی اُجلی مسکانیں

اور
تمھاری گود میں اب تک
میرا بھولا بھالا وہ معصوم سا بچپن کھیل رہا ہے
میں آنکھوں میں
آنسو تھامے
عمر کے اس کمزور سمے میں
دور سے سب کچھ دیکھ رہی ہوں
اشکوں کی کن من برکھا میں
منظر دھندلے پڑ جاتے ہیں
لیکن پھر بھی
اِک فلم سی چلتی رہتی ہے

خزاں بخت

میری بیٹی
جانے کیوں
میرے لیے چوڑیاں لے آئی تھی
مجھ کو پہناتے ہوئے بولی
چوڑیاں تو بس آپ کا ہی سنگھار ہیں ماما
دیکھو کتنی جچتی ہیں
مجھ کو یوں محسوس ہوا
یہ چوڑیاں جیسے
میری بچھڑی سکھیاں تھیں
شوق سے اُن کو دیکھ رہی تھی

شاید مجھ سے بات کریں گی
لیکن
پھر میں نے محسوس کیا
وہ گھور رہی تھیں
ٹھنک کے بولیں
بختِ خزاں کا
دیکھ ذرا
یہ ہاتھ ہے تیرا
یا پھر کوئی
زرد رتوں کا پتا ہے

لمس وہی تھا

میں...... ہسپتال کے بستر پر بے ہوش پڑی تھی
بستر کے چاروں جانب کچھ لوگ کھڑے تھے
اُن لوگوں میں...... کسی ایک نے
میرے ٹھنڈے ہاتھ کو تھاما...... اور سہلایا
ماں آئی تھی......
امی...... امی جی...... کیا آپ آئی ہیں
جی بیٹے...... مم...... میں آئی ہوں
ٹپ ٹپ میرے ہاتھ پہ کچھ آنسو ٹپکے تھے
یکدم میں نے
آنکھیں کھول کے دیکھ لیا تھا

میرا ہاتھ میری بیٹی کے ہاتھوں میں تھا
اُس کا لمس تو بالکل میری ماں جیسا تھا
سبز آنکھوں میں……
ممتا کی گھنگھور گھٹائیں
جل تھل جل تھل برس رہی تھیں
قدرت کا یہ بھید مجھے معلوم نہیں تھا
میری بیٹی ہی تو میری ماں بھی تھی
جیون کی اُس اندھے پل میں
دور کہیں جاتے جاتے
اُس روز میں واپس لوٹ آئی تھی

بہ نوکِ خارمی رقصم

میں ذاتی طور پر ''منظوم خیالات'' اور ''شاعری'' کو دو الگ چیزیں سمجھتا ہوں۔ منظوم خیالات کے لیے انگریزی میں Versification کی اصطلاح اور شاعری کے لیے Poetry کی اصطلاح موجود ہے۔ اور بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں کم و بیش 80 فیصد شاعری منظوم خیالات پر مبنی ہے۔ میں 20 ویں صدی اور 21 ویں صدی کے عشرۂ اول کو ''مطبوعہ جہالت'' کی صدی کہتا ہوں شہناز کا ایک شعر سنیے:

اُس کا آنا اُس کا ملنا اب تک مجھ میں باقی ہے
اک سرگوشی جھول رہی ہے آج بھی کان کی بالی میں

شعر میں وصل کا چمکنا اور سرگوشی میں کسی کی یاد کے سائے سائے زندگی کی شہنائی کو محسوس کرنا ایک مابعدالطبیعاتی احساس ہے۔ مجھے شہناز کی شاعری پڑھ کر اور اُس کے ساتھ زندگی جی کر ایک بہت حیران کن بات یہ بھی لگی کہ اُس نے اپنی شاعری اور عام زندگی میں بھی کبھی بھی اور کہیں بھی Gender Advantage نہیں لیا۔ محض نسوانی پہلو سے قبولِ عام کی کوشش نہیں کی اس لیے بھی کہ بڑی اور عظیم شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس میں تذکیر و تانیث نہیں ہوتی۔ شہناز نے نسوانی جذبات کے بے باکانہ اظہار سے ایمان متزلزل نہیں کیے وہ تو اپنے قاری کو ایک جہانِ تازہ میں لے جاتی ہے۔ جہاں اُس کی ماں ہے، بچے ہیں اور

خاص طور پر اُس کے ابو ہیں۔ اپنے ابو کی وفات پر اُس کا لازوال نوحہ سنیے:

ابو جی:

ہوا نے آپ سے جب اپنا رشتہ توڑ لیا
میں سانس لیتے ہوئے خود غرض سی لگتی ہوں
یہ لوگ درد سے عاری بغیر خون کے لوگ
یہ لوگ آپ کو زیر زمیں لٹا آئے
مجھے زمین پر چلنا عجیب لگتا ہے۔

مجھے تو شہناز کی شاعری کے لیے جو ٹائٹل موزوں لگا وہ ہے ''بہ نوکِ خارمی رقصم'' یہ مجموعہ شہناز کی کل زندگی کی کمائی ہے جو کانٹے پر رقص کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں کہ ہر اعلیٰ ارفع او آفاقی شاعری مولانا روم کے اس مصرعے کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکتی۔

میں اپنی ذات کے پس ماندگان میں ہوں سحر
وہ شخص مجھ کو ملا بھی تو خوں بہا کی طرح

شاعری شہناز کے خمیر میں گندھی ہے اُس کی نظمیں بھی اتنی ہی پر اثر ہیں جتنی کہ غزلیں اُس کی شخصیت تپتی دوپہروں اور سلگتی شاموں میں نظر آتی ہے۔ شہناز کا کمال یہ ہے کہ وہ ''منظر'' اور ''نقاب'' کو ایک کر دیتی ہے۔ وہ چمکتے ہوئے ذروں سے نقاب بناتی ہے اور پھر اُن سے منظر کشیدہ کرتی ہے۔ میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں شہناز کا کون کون سا شعر آپ کے سامنے پیش کروں بس یوں سمجھ لیجیے کہ شہناز کی شاعری خاموشی کے خطِ ساغر پر ایک ڈولتی پرچھائیں کا نام ہے۔

یوں ہی بس وہ مجھ چھوڑ کے سب سے ملتا رہتا ہے
بچہ بھی تو غلط کتابیں رکھ لیتا ہے بستے میں

شہناز کی شاعری کو اگر One Liner میں بیان کرنا ہو تو وہ ایک جملہ یہ ہے کہ شہناز کا شعر:

اُس کے دل سے انگلیوں تک کا سفر ہے

بقول غالب:

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

شہناز کی شاعری ہمارے صوفی شعراء کی شاعری کی توسیع ہے اُس کی غزل میں تصوف ایک لازم جزو ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ شہناز کے نزدیک تصوف بے عملی یا فرائض سے فرار اور غفلت کی رومانوی کیفیت کا نام نہیں ہے اُس کی شاعری میں تصوف کا پہلو جب بھی آتا ہے تزکیۂ نفس کے لیے آتا ہے۔

یہ تعبیر ذات اور تزکیۂ نفس کا وہ عمل ہے کہ اس روحانی تجربے سے شہناز بار بار گزری ہے۔ جزو کا کل میں ضم ہو جانا، قطرے کا دریا میں مدغم ہونا ہے وہ جانتی ہے کہ جب قطرہ انفرادی حیثیت میں ہوتا ہے ہے تو وہ قطرہ ہی ہوتا ہے اور جب وہ دریا میں ضم ہو جاتا ہے تو قطرہ نہیں رہتا مکمل دریا بن جاتا ہے کیونکہ اس قطرے کو واپس دریا سے اُس کی انفرادی حیثیت سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔

بقول غالب:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

شہناز جمال سے مجسمے تراشتی ہے اور وہ مجسمے بولنے لگتے ہیں اس لیے شہناز کی شاعری کا ایک بڑا وصف اُس کی متحرک جمالیات ہے۔

اڑتی رہی فلک پہ ستاروں کی اوڑھنی
سر سے بہت ہی دور روا دی گئی مجھے

شہناز کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو Repeat نہیں کرتی ورنہ مجموعہ کلام تو

شاعر یا شاعرہ کا ایک طرح کا CT سکین ہوتا ہے کوئی وصف اور کوئی خامی چھپ نہیں سکتی شہناز خیال کے ایک موج در موج سلسلے اور ریلے میں روشنی کی بوند بن کر رہتی ہے وہ جانتی ہے کہ موسیقی اگر ہوا میں گرہ لگانے کا نام ہے تو شاعری ہوا میں تصویر بنانے کا کام ہے۔ موجِ خیال کے اس ارژنگ میں وہ مادام تساؤ ہے۔

مصحفی کا ایک شعر سنیے:

آستیں اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

شہناز آستیں میں جمال رکھتی ہے ورنہ تو لوگ آستین میں سانپ رکھتے ہیں نجانے اور کتنی باتیں ہیں جو تشنہ رہ گئی ہیں مجھے اپنے کم مائیگی اور کم علمی کا اعتراف ہے میں چونکہ بنیادی طور پر شاعر ہوں لہٰذا نثر کے اس پیرائے میں میرا دل سیراب نہیں ہوا میں شہناز کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک دلی خواہش کا اظہار اپنے اس شعر کی صورت میں کر رہا ہوں۔

تیمّم کر بھی لو اب میرے دل سے
یہ پتھر پاک ہونا چاہتا ہے

راؤ ذوالفقار فرخ

منظروں اور کومل جذبوں کی مصورہ

لفظ گونگے ہو چکے ہیں مان لینا چاہیے
ورنہ کیا ان پر کوئی اہل کتاب آیا نہیں

بہت عرصہ پہلے جب یہ شعر پڑھا تو واقعی لگا کہ شاید اب لفظ کی آواز معدوم ہو چکی ہے یا پھر اس کے بوڑھے چہرے پر اتنی جُھریاں پڑ چکی ہیں کہ یہ اپنی جاذبیت کھو چکا ہے۔ اس کے اثر کی شدتیں ضعف سے ایسے ہانپ رہی ہیں کہ اس کی کپکپاتی صدائیں فہم کی سماعتوں پر گراں گزرتی ہیں اور یہ جہان سُخن کی کالی مہیب چادر پر اب کبھی مشعل نور بن کر نہیں جھلملا سکے گا۔ یہ صرف مایوسیاں اور اندھیرے بانٹے گا۔ مگر مجھ جیسے کم علم کو یہ ادراک ہی کہاں تھا قدرت اپنی تخلیق کی حفاظت اور تزئین کی ذمہ داری قبول کر چکی ہے جیسے انسانوں کی اصلاح اور اُنہیں وقار اور تمکنت سے جینے کے آداب سکھانے کے لیے ہر دور میں پیغمبر بھیجے گئے اسی طرح لفظ کی حرمت اور بقا کے لیے بھی ایسے سخنور تخلیق کیے کہ جو اُس کی تا ابد حفاظت کی ضمانت ہیں۔ میں اکثر شہناز پروین سحر پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں اور ایک بات جو ایمان کی حد تک مجھ میں سرائیت کر چکی ہے کہ وہ ”سحر“ نہیں بلکہ ”ساحرہ“ ہیں۔ خالق کائنات نے ہر ذی روح کو اپنی کسی نہ کسی صفت سے مزین ضرور کیا ہے مجھے اکثر لگتا ہے کہ اُنھیں اللہ پاک نے تخلیق کے اس بنیادی وصف سے نواز دیا کہ وہ دنیائے خیال کے کسی چہرے کو بھی اگر خدوخال عطا کرنا چاہے تو

وہ بس سوچتی ہیں اور وہ ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ وہ لفظوں کا منتر پڑھ کر تخیلات کے طلسم کدے پر پھونکتی ہیں تو اُس میں سے ہزاروں شکلیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ ساحرہ صرف محبتوں کی خالق ہیں۔ درگزر وہ سہ جانے کے ہنر سے مالا مال ہیں عورت ہو کر بھی کہتی ہیں کہ:

''بچہ بھی تو غلط کتابیں رکھ لیتا ہے بستے میں''

ان کے جادو میں فلاح ہے بنی نوع انسان سے والہانہ عشق ہے۔ کیفیات کی تجسیم اور جذبوں کی ترسیل کا ایسا ہنر ہے شہناز پروین سحر کے پاس جو آنسو اور مسکراہٹیں ایک ہی ہچکی میں یکجا کر دیتی ہیں بالکل ایسے ہی جیسے سرمنڈل اور بانسری ایک ہی سازندہ اُسی مہارت سے ایک ساتھ بجا رہا ہو۔

مری ہی کرچیوں سے اک نیا وجود ڈھلا
اور اُس کے بعد مجھے شہر بے امان ملا

بے ثباتی اور بے بسی کی کیفیت کا یوں آسان پیرائے میں معصوم انداز سے اظہار بھی آپ ہی کا خاصہ ہے۔ شہناز پروین کی شاعری اپنی ذات کے روایتی دُکھ پہ گریہ زاری نہیں بلکہ ایک اجتماعی کرب کی آئینہ دار ہے۔ میں پچھلے تیس سالوں سے شہناز پروین سحر کے لفظوں کا ہم سفر ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُن کے لفظوں کی گود ہی میں سخن کی لوریاں سُن کر شعری شعور کی منازل طے کر رہا ہوں مگر اُن کے لفظ ہمیشہ جذبوں کے اظہار کا ایک بہت اونچا پہاڑ ایستادہ ہے اُن کے سامنے جس تک صرف انہیں کی رسائی ہے۔ وہ جب چاہیں جیسے چاہیں کسی بھی کیفیت کو کوئی بھی روپ دے سکتی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ ایک ہی مصرعے میں طلسمات کے کئی در وا کر دیتی ہیں جیسا کہ یہ شعر:

میں اپنی ذات کے پسماندگان میں ہوں سحر
وہ شخص مجھ کو ملا بھی تو خوں بہا کی طرح

باطن سے جُڑی یادوں کو ظاہر کے فریم میں سجانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ سوچ کو لفظ کے ساحل پر پڑاؤ ڈالنے کے لیے تخیل کے مضبوط خیمے کی ضرورت ہوتی ہے اور اکثر ایسا پختہ

سائبان فراہم نہیں ہوسکتا۔ ایسے تجربات سے تقریباً ہر لکھنے والا گزرتا ہے جب وہ اپنی محسوسات کو بعینہ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے بے قراری اور اضطراب کے عمل سے دوچار ہو رہا ہوتا ہے اور اکثر اوقات وہ ایسا کرنے میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوتا۔ اور بہت سے لکھنے والوں کو تو یہ کرب ہر بار سہنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے عہد کی اس بڑی شاعرہ شہناز پروین سحر کو یہ اعجاز نصیب ہوا کہ وہ سوچوں کو تجسیم کر دینے کے ہنر میں یکتا ہیں۔ وہ جو سوچتی ہیں اس کو اُسی شدت اور لطافت سے شکل بھی عطا کر دیتی ہیں۔ غزل کے رخساروں پر اُن کے ہونٹوں سے مس ہونے لفظوں کا غازہ تو پوری تب و تاب سے رعنائیاں بکھیر رہا ہے مگر اُن کی نظم بھی عہدِ حاضر کی رہبری کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہے۔ میں نے اُن کی نظم کو بار بار پڑھا اور خود کو اس میں موجود کیفیات میں ڈھالنے کی کوشش کی تو مجھ پر کُھلا کہ ایسی نظم کہنا کسی عام لکھنے والے کے بس کی بات نہیں۔ ایک الہام کی سی صورت ہے۔ ایک تواتر ہے سوچوں کا جو بہت روانی سے بہہ رہا ہے اور مزے کی بات ہے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں بہا کر لے جا رہا بلکہ اس بہاؤ میں سبھی یادیں زنجیر بن کر وقت کے پیروں کو جکڑ لیتی ہیں اور سوچ کو منجمد کر دیتی ہیں۔ لمحے اپنے اردگرد ٹہلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظم میں موجود سبھی کردار سچ میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مجھے اپنے نصیب پر رشک آ رہا ہے کہ عہد حاضر کی اس نامور شاعرہ کی کتاب پر مجھ جیسے کج فہم اور کم علم شخص کو کچھ لکھنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے دامان کی تنگی کا اعتراف ہے لیکن اقلیم عشق بھی عجیب شے ہے نہ جہاں فہم کی فصیل نہ علم کی راہداری اور نہ عقل کا دروازہ ہوتا ہے بس یہ خالق کی عطا ہے کہ جسے نواز دے اور میں اس عطا پر بے حد خوش ہو کہ جنھیں پڑھ کر لکھنا سیکھا انھیں پر کچھ لکھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ میری دُعا ہے کہ آپ یونہی لکھتی رہیں اور شہر حرف کے سب مکینوں کے ماورائی خدوخال کو جسم کے آئینوں میں سجاتی رہیں۔ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں بہت سا پیار۔

محبوب صابر

یکم جولائی 2015 سیالکوٹ

پہلے ماں پھر شاعرہ

شہناز پروین سحر کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ بہت کچھ ایسا ہے جو لفظوں میں پروئے جانے کا محتاج بھی نہیں ہے تاہم میری اس تحریر کا مطمع نظر ایک ماں کے طور پر ان کے اور میرے رشتے کی باریکیاں ہیں۔

ان کا وجود نہ صرف میرے لیے زندگی حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ بلکہ انھوں نے مجھے میری زندگی آزادی کے ساتھ جینے کا حق اور اختیار بھی دیا۔ میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو اپنی اُس تقدیر کے پابند اور قیدی ہوتے ہیں جو ان کے لیے اُن کے والدین کی طرف سے لکھ دی جاتی ہے۔

میرے معاملے میں میری ماں نے مجھے مکمل آزادی اور انفرادیت کا بھرپور احساس دیا...... جس کے باعث میں نے...... زندگی کے حقیقی معانی کو سمجھا...... اور پھر اس کے نتیجے میں اپنی قدریں طے کیں...... جو اگرچہ میری ماں کی اقدار سے مختلف تھیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ان کا احترام کیا اور انہیں تسلیم کیا۔

ایک ایسے معاشرے میں رہنے کے باوجود جہاں عام طور پر والدین اپنے بچوں کی زندگیوں میں اپنی من مانی کرتے ہیں، انہوں نے مجھے اپنی زندگی کے فیصلے کرنے اور اُن کا رُخ خود متعین کرنے کا اختیار دیا۔ بیشتر ماؤں کے طرح انھوں نے مجھ سے کبھی ڈاکٹر یا انجینئر

بننے کی فرمائش نہیں کی۔

اس کے برعکس انھوں نے مجھے خواب دیکھنا سکھایا اور پھر ان خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے مضبوطی فراہم کی ...... ایسی مائیں بہت کم ہوتی ہیں جو اپنے بچوں میں اطمینان اور تشفی کے احساس پنپنے دیتی ہیں جو کسی فنکار کی پرورش کے لیے انتہائی اہم ہوتا ہے۔ میری ماں واقعی ایسا کرسکتی تھیں۔ اُس مکمل آزادی کے احساس کے ساتھ جو انہوں نے مجھے بخشا۔

انہوں نے مجھے بہت چھوٹی عمر سے ہی کلاسیکی موسیقی، ادب، فلموں اور آرٹس سے آشنا کر دیا۔ میں اپنی نوعمری میں ہی استاد سلامت علی، مہدی حسن اور مدن موہن جیسے فنکاروں کو سننے لگا تھا۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہیں جب وہ مجھے شوکمار بٹالوی اور فیض احمد فیض کی شاعری اور سعادت حسن منٹو کے افسانے سمجھاتیں اور ان تحریروں کی گہرائی تک رہنمائی کرتیں......

میں نے انہیں بتایا کہ میں گٹار بجانا چاہتا ہوں تو انھوں نے نہ صرف مجھے وہ خریدنے کی رقم دی بلکہ میرے ساتھ گٹار خریدنے بھی گئیں اور اپنی زندگی کا پہلا گٹار منتخب کرنے میں میری مدد بھی کی۔

میں نے انھیں بتایا کہ میں ناول لکھ رہا ہوں تو انھوں نے اس کا ایک ایک لفظ مجھ سے سُنا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ ہنستیں اور میرے ساتھ روتیں۔ انھوں نے خود اپنی غیر معمولی شاعری کی اشاعت کے لیے نہیں سوچا لیکن میرا ناول شائع کروایا۔

میرا اپنی ماں سے بے حد خوبصورت رشتہ ہے، وہ بلا شبہ میری بہترین دوست ہیں۔ وہ ایسی واحد شخص جن کے ساتھ میں کچھ بھی اور سب کچھ شیئر کرسکتا ہوں۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کبھی بھی اُن سے کچھ چھپایا ہو۔ اس کی وجہ سے وہ ناقابل یقین انڈرسٹینڈنگ ہے جو ہمارے بیچ برسوں میں پروان چڑھی ہے۔ ہم ایک ہی کمرہ شیئر کرتے ہیں، صبح نیند سے جاگنے پر جو پہلا چہرہ میں دیکھتا ہوں وہ انہی کا ہوتا ہے۔ اکثر راتوں کو ہم ادھر اُدھر کی باتیں کیے ہی چلے جاتے ہیں جب تک کہ سو نہ جائیں۔

بعض اوقات جب میں دوستوں کے ساتھ باہر زیادہ وقت گزارتا ہوں تو انھیں پریشانی تو ہوتی ہے مگر وہ مجھے سمجھتی اور میری سوشل لائف کا احترام کرتی ہیں۔ ہم تقریباً روز ہی شطرنج کھیلتے ہیں اور زیادہ تر میں ہی جیتتا ہوں۔ وہ ہارنے پر اداس ہونے کا دکھاوا کرتی ہیں...... درپردہ اپنی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے اس فخر کو چھپانے کی کوشش کرتی ہیں جو ان کی آنکھوں میں صاف جھلکتا ہے۔ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں سب سے پہلے ان کو سناتا ہوں، اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس سے اماں اپنی شاعری شیئر کرتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں......

میں اپنی زندگی میں جتنی بھی غیر مشروط اور بے غرض محبت دیکھتا ہوں اس کا واحد سبب وہی ہیں۔ وہ میرا واحد ایسا رشتہ ہیں جو بدلے میں مجھ سے کچھ نہیں چاہتا۔ انھوں نے مجھے اپنی ذات سے بڑھ کر توجہ اور محبت دی میری ماں کا ہاتھ ایک نازک پھول ہے۔ اور پانچ انگلیاں جیسے اُس پھول کی پانچ پتیاں۔

لیکن یہ نازک ہاتھ ہر اس مصیبت اور مشکل سے لڑتا آیا ہے جو کبھی میری راہ میں میرے مقابل آئی ہو۔

یہ بیان کرنے کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں کہ میں کس قدر خوش بخت ہوں کہ میں نے ان ہاتھوں میں پرورش پائی۔ واحد بات جس پر مجھے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں اُنہی کے وجود کا ایک حصہ ہوں۔ اور یہ میں تا عمر ان کے وجود کی ابدی گرمی میں ہی رہوں گا۔ جب تک میں ہوں، وہ میرے ساتھ رہیں گی۔

اب وہ اکثر اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر کہتی ہیں کہ ان کے ہاتھ کیسے کمزور اور ناتواں ہو گئے ہیں اور یہ کہ اب ان سے زیادہ دیر کچھ تھاما نہیں جاتا لیکن یہی وہ ہاتھ ہیں جو میرے وجود کے جوہر، رنگوں، خوشبو اور روشنی کو تھامے ہوئے ہیں۔

ان کی ذہنی اور شاعرانہ صلاحیتوں کی سطح کو دیکھا جائے تو انہیں اس سے بے حد کم

جانا اور تسلیم کیا گیا ہے جس کی وہ حق دار ہیں۔ میں یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہوں کہ جو تخلیقی صلاحیتیں وہ رکھتی ہیں خود ان کی تمام عمر بھی ان کی قابلیت کے جواز کو نا کافی ہوگی۔

سو...... یوں ہے کہ ...... میں خود کو انہی کے شعلے کی دمک سمجھتا ہوں اور میں اپنی زندگی میں جو بھی بھلائی کروں گا وہ ہمیشہ انہی کی جانب سے ہوگی۔ میری زندگی میں اُن کی دمک اور روشنی کبھی بھی کہیں بھی نہیں رکے گی!

ترتیل راؤ

شہناز ہماری نظموں کی شاعرہ ہے۔ اس کی شاعری سرگوشیوں کی آنکھوں سے سرگوشی کرتی ہوئی تنہائی کی ہلکی کرن ہے۔ شہناز کی ذات اور شاعری، چمک اور سائے کے درمیان میں واقع ہے۔ اس کی شاعری ایسی گلی ہے جو [illegible] نہیں رہ سکتی۔

شہناز کی شخصیت اور شاعری دونوں ایک خوش نما شعر ہیں۔ وہ خواب اور حقیقت دونوں میں ایک وقت زندہ ہے۔ وہ اپنی ذات کو اوڑھ بھی سکتی ہے۔ [illegible] اوڑھ اپنی زندگی کا سب سے بڑا تخلیقی عمل ہے کہ اوڑھے ہوئے میں [illegible] احساسات کے [illegible] رہتے ہیں۔ میں شہناز کی شاعری کو ہوا ایک نئی کرن دو۔

راؤ ذوالفقار فرخ

2016

سانجھ
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan
Phone: +92 42 37355323, Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Visit: www.sanjhpublications.com